غالب
اور
حیدرآباد

www.taemeernews.com

غالب اور حیدرآباد

ضیاء الدین احمد شکیب

جملہ حقوق محفوظ

پہلی بار : فروری ۱۹۶۹ء

تعداد : ۵۰۰

کتابت : محمد غالب خوش نویس

طباعت : نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چار مینار

ناشر : ادبی ٹرسٹ حیدرآباد

قیمت : ۷ روپیے

ملنے کا پتہ

ادبی ٹرسٹ بک ڈپو کمان ایکسل بلڈنگ

حیدرآباد-۱

(اے-پی)

www.taemeernews.com

فہرس

پیش لفظ ۵

فضا ——

حیدرآباد —— ایک پس منظر ۹
عہدِ غالب کا حیدرآباد ۱۵
حیدرآباد پس از غالب ۲۸

تعلقات ——

تماشائے اہل کرم ۴۳
ادبی تعلقات ۹۵
سخنہائے گفتنی ۱۲۷

دبستان ——

تشکیل ۱۷۲
اثرات ۱۸۷

غالبیات ——

انتقادیات ۱۹۹
غالب کی شرحیں ۲۱۰
شذرات ۲۱۹
آثار —— ۲۲۲

www.taemeernews.com

تصاویر

مرزا غالب

راجہ چندولال ۲۶

نواب افضل الدولہ ۲۷

حبیب اللہ ذکا ۱۱۲

قربان علی بیگ سالک ۱۱۳

میاں دادخاں سیاح ۱۲۶

قدر بلگرامی ۱۲۷

مولانا حالی ۲۱۰

نظم طباطبائی ۲۱۱

ڈاکٹر سید عبداللطیف ۲۱۰

عکس

قصیدہ در مدح سالار جنگ ۸۰

خط بنام ذکا ۵۷

نسخہ مصحفی کا ایک صفحہ ۲۲۲

www.taemeernews.com

پیش لفظ

یہ خوش آیند بات ہے کہ غالب کی شاعری پر مختلف زاویہ ہائے فکر و نظر سے مطالعہ کا آغاز ہو چکا ہے اور غالب فہمی کے نئے نئے امکانات روشن ہوتے جا رہے ہیں تاہم غالب کی زندگی پر تحقیق کے زاویوں میں اتنا تنوع اور اس کی رفتار میں اتنی سرعت پیدا نہیں ہوئی جتنی ہونا چاہیے تھی۔ ابھی غالب کے بارے میں بہت سے ابتدائی سوالات ایسے ہیں جن کا ہمیں جواب نہیں مل سکا ہے۔ غالب کی شاعری آفاقی ہے اور اُن کی شخصیت ملک گیر ہے۔ ہندوستان کے مختلف علاقوں میں غالب کے شاگرد، احباب ممدوحین، اور دوسرے اہل معاملہ بکھرے ہوئے تھے۔ ہندوستان بھر میں گذشتہ ایک صدی میں غالبیات پر ہر جگہ کچھ نہ کچھ کام ہوا ہے بہت سا کام ابھی مخطوطوں کی شکل میں پڑا ہے جن کی اشاعت سے

www.taemeernews.com

نئی حقیقتیں سامنے آئیں گی۔ ان حالات کے پیش نظر اس کی ضرورت ہے کہ ہندوستان کے مختلف علاقوں میں علاقائی نقطہ نظر سے غالب پر تحقیقی توجہ دی جائے۔ اس سے یقین ہے کہ نہ صرف بہت سی نادر چیزیں سامنے آجائیں گی بلکہ غالب کی بکھری ہوئی شخصیت اپنے پورے قد و قامت کے ساتھ متجسم ہو کر ہمارے سامنے آسکے گی۔ اور نئے نئے ماخذ روشنی میں آئیں گے۔

اسی خیال کے پیش نظر غالب اور حیدرآباد کا مطالعہ کیا گیا ہے اس مطالعہ میں بعض معاملات میں معلومات کی شدید کمی محسوس کی گئی ہے لیکن بالعموم پر مغز مواد کی فراوانی ہے جس سے پورا پورا استفادہ ان اوراق میں ممکن نہیں ہے۔ بہت سی جزئیات کو نظر انداز اور تفصیلات سے گریز کرتے ہوئے یہ مطالعہ ختم کیا گیا ہے۔

غالب اور حیدرآباد کے تعلق سے بیشتر مواد فارسی میں ہے۔ اس کی پوری کوشش کی گئی ہے کہ جہاں تک ہو سکے مباحث میں فارسی داخل نہ کی جائے۔ تاہم فارسی ماخذ سے استفادہ کیا گیا ہے اور جہاں جہاں ضرورت ہوئی تراجم یا مطالب اردو میں دیئے گئے ہیں۔

حیدرآباد کی گذشتہ سو ڈیڑھ سو سال کی تاریخ بالعموم نئی نسلوں

www.taemeernews.com

کی نظر سے اوجھل ہے ہندوستان کے دوسرے علاقوں اور ہندوستان کے باہر غالب اور حیدرآباد کے موضوع پر کسی گفتگو سے استفادہ اس وقت تک ممکن نہیں ـــ جب تک زیر بحث مدت کے حیدرآباد کا تصور سامنے نہ ہو۔ اسی ضرورت کے پیش نظر ابتدا میں " فضا " کے تحت اس حیدرآباد کی ایک تصویر پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو حیدرآباد یا اس مطالعے سے متعلق ہے۔

یہ کام مجھے ایک ایسے وقت سونپا گیا جب غالب صدی تقاریب کے لیئے صرف تین ہفتے باقی تھے۔ اس مختصر سی مدت میں اس موضوع سے انصاف کرسکنا دقت طلب اور جو وسائل موجود ہوں ان سے استفادہ کرنا مشکل تھا۔ بہرحال تین چار ہفتوں میں جو بن پڑا وہ کیا۔

برادرم مصلح الدین سعدی نے اگر اپنے شب و روز اس کام کے لیئے وقف نہ کر دیئے ہوتے تو یہ کام ہرگز نہیں ہوسکتا تھا۔ اس کتاب کی تکمیل میں سعدی نے ہر مرحلہ پر ہر طرح سے جو تعاون کیا ہے وہ نازشِ دوستی ہے۔

میں اپنے عزیز دوست سید یعقوب حسن کا شکر گزار ہوں

www.taemeernews.com

کہ انہوں نے کتابت، طباعت اور تصحیح کا سارا کام اس قلیل مدت میں جس قدر بہتر ممکن تھا اپنی نگرانی اور توجہ سے مکمل کروایا۔ سرورق اور تصاویر برادرم انیس الدین سلمہ کے حسن مذاق کے آئینہ دار ہیں۔ اس کتاب میں بعض تصاویر پہلی دفعہ شائع کی جارہی ہیں۔

ناسپاسی ہوگی اگر قاری محمد غالب صاحب خوشنویس و کمرشیل آرٹسٹ، اور نیشنل فائن پرنٹنگ پریس کا شکریہ ادا نہ کیا جائے۔

آخر میں میں اپنے محترم دوست جناب عابد علی خاں صاحب ایڈیٹر "سیاست" و معتمد ادبی ٹرسٹ کا تہہ دل سے شکر گذار ہوں کہ انہوں نے ادبی ٹرسٹ کی جانب سے اس کتاب کو شائع کیا اور اس کی تکمیل میں مجھے ہر طرح کی سہولت بہم پہنچانے میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا۔

ضیاءالدین احمد شکیب

۲۵۔ فروری ۱۹۶۹ء

پرویز ولا، چنچل گوڑہ
حیدرآباد۔ ۲۴

www.taemeernews.com

فضا

- حیدرآباد — ایک پس منظر
- عہدِ غالب کا حیدرآباد
- حیدرآباد پس از غالب

حیدرآباد — پس منظر

(۱۵۹۱ تا ۱۷۶۱ء)

جنوبی ہند کا عظیم الشان شہر حیدرآباد، نئی نسلوں کے لئے نئے ہندوستان کی ریاست آندھرا پردیش کے صدر مقام کی حیثیت سے متعارف ہے۔ ریاست آندھرا پردیش کی تشکیل یکم نومبر ۱۹۵۶ء میں عمل میں آئی، گویا یہ کل ہی کی بات ہے۔ لیکن حیدرآباد ایک دن میں تعمیر نہیں ہوا۔

موسیٰ ندی کے کنارے 78° 27' E اور 15° 18' N پر یہ شہر آج سے پونے چار سو سال سے زائد عرصہ پہلے ۱۵۹۱ء میں دکن کے پانچویں قطب شاہی حکمران محمد قلی قطب شاہ نے بسایا تھا۔ اس شہر کے بسانے کا آغاز یہاں کی مشہور عمارت چارمینار کے سنگ بنیاد سے ہوا اور ۱۵۹۲ء میں یہ عمارت مکمل ہوئی۔ یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ قطب شاہی سلطنت

www.taemeernews.com

کی حدود کم و بیش وہی تھیں جو موجودہ ریاست آندھرا پردیش کی ہیں۔ قطب شاہی سلطنت کی اصل آبادی اگرچہ تلنگی بولنے والوں کی تھی لیکن اس میں جنوبی ہند کے ساحلوں سے گئے ہوئے عرب، حبشی اور تغلق دور کے شمالی ہندوستان سے آئے ہوئے ترک اور ایرانی باشندے بھی تھے۔ قطب شاہی دور میں اس علاقہ کی آبادی کی ساخت میں ایسی غیر معمولی تبدیلیاں ہوئیں جس کے نتیجہ میں بالعموم اس علاقہ اور بالخصوص شہر حیدرآباد کی تہذیب پر غیر معمولی اثرات پڑے۔ بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ یہ زمانہ دراصل دکن میں ہندوستانی تہذیب کے ایک نئے اسلوب کی تشکیل کا زمانہ تھا جس کو اکثر ادیب اور مورخین دکنی تہذیب سے موسوم کرتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ دکنی تہذیب کی ساخت اس کے مزاج اور مفہوم کو سمجھے بغیر "حیدرآباد" کو سمجھنا مشکل ہوتا ہے بلکہ اس دور کے کسی لمحہ میں ہاتھ کے کسی واقعہ یا کسی شخصیت کے حیدرآباد سے ربط و تعلق کو سمجھنا اور بھی مشکل کام ہے۔

مرزا غالب کا حیدرآباد سے جو تعلق رہا ہے یا مختلف ایام میں حیدرآباد اور حیدرآبادیوں کے تعلق سے ان کی رائے میں جو تبدیلیاں ہوئی ہیں اور خود حیدرآباد اور حیدرآبادیوں نے مرزا غالب کو مختلف مواقع پر جیسا سمجھا ہے اور ان سے اثر قبول کیا ہے، ان سب باتوں کو واضح طور پر سمجھنے کیلئے حیدرآبادی تہذیب اور اسکے مختلف ادوار کے بارے میں وہ ابتدائی واقفیت ضروری سی ہے جس کا تذکرہ ان سطور میں چھیڑا گیا ہے۔

www.taemeernews.com

دکن میں قطب شاہی سلطنت کا آغاز کم و بیش اس زمانے سے کچھ ہی پہلے ہوتا ہے جب شمالی ہند میں سلطنت مغلیہ کی بنیاد پڑتی ہے۔ اور یہ دونوں واقعات اس اہم تاریخی واقعہ کے بعد رونما ہوتے ہیں جس کو واسکوڈی گاما کی "دریافت ہند" سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس واقعہ نے نہ صرف ہندوستان اور یورپ کے درمیان مہم آزماؤں کے ذریعہ تعلقات کے دروازے کھول دیئے بلکہ عرب اور بالخصوص ایران سے جنوبی ہند کے بحری سفر کو آسان، تیز رفتار اور محفوظ بنا دیا۔ محمد قلی قطب شاہ کے دور میں سیاسی، تجارتی، مذہبی اور نسلی وجوہات تھیں بھی ایسی کہ جن کی وجہ سے قطب شاہی سلطنت کے تعلقات مغلوں کی بہ نسبت ایرانیوں سے زیادہ بڑھ رہے تھے۔ ان تعلقات کی وجہ سے ایرانی علماء، ماہرین نظم و نسق اور سپہ گری، معمار، شعراء، ادیب، اطباء، مصور اور موسیقار اس کثرت سے حیدرآباد میں آبسے کہ حیدرآباد بعض معاصر اہل قلم کے بیان کے مطابق اصفہان بن گیا تھا۔ اصفہان کے تعلق سے ایران میں یہ فقرہ زبان زد خاص و عام تھا کہ "اصفہان نصف جہان" اور اصفہان وہ مقام ہے جس کی محبت میں غالب نے نغمہ سرائی کی ہے۔

"در نجف مردن خوش است و در صفاہان زیستن"

اس طرح جنوبی ہند میں ایک طویل عرصہ کے بعد پھر ایک شہری تمدن

www.taemeernews.com

کو فروغ حاصل ہوا جو اگرچہ بظاہر عجمی طرز کا تھا لیکن درحقیقت آندھرا کے علاقائی تمدن سے ایک خاص انداز میں مربوط تھا۔ جو بتدریج تہذیب کے مختلف مظاہر میں ایک گہرے امتزاج کی صورت اختیار کرتا جارہا تھا۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ اس امتزاج کے نتیجہ میں کئی ایسی تہذیبی ثقافتی اور لسانی حقیقتیں وجود میں آرہی تھیں جن کا سلسلہ آج بھی حیدرآبادی تہذیب کی شیرازہ بندی کرتا ہے۔ ان میں سے اس دور کی لسانی اور ادبی ترقی اس موقع پر قابل توجہ ہے۔ فارسی ادبیات کو اس زمانے میں فروغ ہوا اور جو ایرانی ادیب دکن آئے ان میں کئی ایسے ہیں جن کے علمی و ادبی مقام و منزلت کے مرزا غالب معترف ہیں۔ جلالائے طباطبای اور طاہر وحید کو مرزا نے مثال کے طور پر پیش کیا ہے۔ لیکن فارسی ادب سے زیادہ اُردو زبان و ادب کی ترقی اس دور میں قابل لحاظ ہے۔ قطب شاہی سلطنت نے اُردو کو جو علمی اور ادبی سرمایہ دیا ہے، بیجاپور کی عادل شاہی سلطنت کو چھوڑ کر، ہندوستان کا کوئی دوسرا علاقہ اس کی نظیر نہیں پیش کرسکتا۔ محمد قلی قطب شاہ اُردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر سمجھا جاتا ہے۔ دکنی زبان نے علمی و ادبی طور پر قطب شاہی سلطنت کے آخری دور تک ترقی کی اور یہ زبان ایک ایسے مزاج کی حامل تھی جس میں عجمی، تازی اور ہندی عناصر کا ایک غیر معمولی امتزاج تھا۔ محمد قلی نے کسی نئے مذہب کی بنیاد

www.taemeernews.com

تو نہیں رکھی لیکن اس نے محبت کو سب کا مذہب بنایا۔ قطب شاہی حکمران عوام میں اس قدر مقبول تھے کہ اس سلطنت کے خاتمہ کے بعد برسوں تک دکن کے شاعروں نے ان کی یاد میں نوحہ خوانی کی ہے۔

سنہ ۱۶۸۷ء میں مغل شہنشاہیت کے پھیلاؤ نے قطب شاہی سلطنت کا خاتمہ کر دیا۔ اورنگ زیب نے حیدرآباد کو دارالجہاد قرار دیکر اس کی راجدھانی کی حیثیت ختم کر دی۔ اور حیدرآباد کا پایہ تخت اورنگ آباد منتقل ہو گیا۔ شہر حیدرآباد کی تہذیب نہ صرف تیزی کے ساتھ انحطاط کا شکار ہو گئی بلکہ اس معتوب ضلع میں کس میرسی اور گمنامی کے گرد و غبار یں دب کر رہ گئی۔ اس دور کے حیدرآباد کے اگر کچھ ادبی آثار ملتے ہیں تو وہ اس شہر کے مرثیے ہیں۔

تقریباً ایک صدی تک حیدرآباد کسی بھی حکومت کے پایہ تخت ہونے کے شرف سے محروم رہا۔ ان سیاسی حادثوں کا اثر شہر حیدرآباد پر یہ پڑا کہ یہاں کے باشندوں میں مغل تہذیب سے ایک طرح کی نفرت پیدا ہو گئی اور قطب شاہی تہذیب کی یاد ہی ان کے لئے باعث سکون تھی۔ چنانچہ مغل تہذیب سے انحراف اور قطب شاہی تہذیب سے وابستگی کے جذبے نے اس علاقہ کی زبان کو کافی متاثر کیا۔

سنہ ۱۷۲۴ء میں آصفجاہی سلطنت قائم ہوئی جو بشمول حیدرآباد چند

www.taemeernews.com

دکنی صوبوں پر مشتمل تھی اس سے ایک ایسا ماحول ضرور فراہم ہوا جس سے اہل حیدرآباد کی تخلیقی صلاحیتوں کو کسی حد تک ایک بار پھر ابھرنے کا موقع ملا۔ اس وقت تک ولی اور سراج کے زیر اثر حیدرآباد کی علمی اور ادبی زبان شمالی ہند کی اردو زبان سے کچھ نہ کچھ صحت مند اثرات قبول کر چکی تھی۔ تاہم یہ اثرات مکمل نہیں تھے۔

۱۷۶۲ء میں نظام علی خاں آصف جاہ ثانی کے عہد حکومت کا آغاز ہوتا ہے جس کے کچھ ہی عرصہ بعد پایہ تخت حیدرآباد منتقل ہو جاتا ہے اور اس شہر کو ایک نئی زندگی ملتی ہے اس کے چند برسوں بعد ہمیں عہد غالب کا حیدرآباد دکھائی دیتا ہے۔

www.taemeernews.com

عہدِ غالب کا حیدرآباد
(۱۷۶۱ تا ۱۸۶۹)

(حیاتِ غالب ۱۷۹۷ تا ۱۸۶۹)

مغل سلطنت کے زوال کے بعد ہندوستان کے سیاسی نقشہ کی تشکیل دو متوازی خطوط پہ ہو رہی تھی۔ ایک طرف تو ملک کے مختلف حصے برطانوی سامراج کے زیر اقتدار آ رہے تھے جو بالآخر برطانوی ہندوستان کی صورت اختیار کرنے والے تھے۔ دوسری طرف ملک کے مختلف علاقوں کے مغل صوبہ دار اور حاکم اپنی خود مختاری کے درپے تھے۔ غالب کی پیدائش تک علاقائی مغل حکمرانوں اور انگریزوں کے درمیان آویزش اور آمیزش کا پیچیدہ سلسلہ ختم ہو رہا تھا۔ ملک درحقیقت ان دو زمروں کی سیاسی قوتوں میں تقسیم ہو چکا تھا۔ مغل شہنشاہ شاہ عالم جسکی شہنشاہیت "از دلی تا پالم" تھی اسی کے عہد کے آخر میں مرزا غالب پیدا ہوئے۔ شاہ عالم ثانی کا دور اگرچہ مغل حکمرانوں

www.taemeernews.com

میں اورنگ زیب کے بعد سب سے طویل ہے لیکن سیاسی حیثیت سے اسی نام نہاد شہنشاہ کے دور میں مغل اقتدار ختم ہو چکا تھا۔ ہندوستان کی بعض علاقائی ریاستیں شاہ عالم کی مملکت سے زیادہ طاقت ور، مرفہ الحال اور مستحکم تھیں۔ سچ تو یہ ہے کہ شاہ عالم ثانی کی آمدنی کا بڑا انحصار علاقائی حکمرانوں کی اس پیش کش پر تھا جو اب بھی عقیدتاً وہ مغل حکومت کو نذر کر رہے تھے۔ ہندوستان کی تمام علاقائی حکومتوں میں سب سے بڑی خوش حال اور مستحکم حکومت، حکومتِ آصفیہ تھی آصف جاہ اول (۱۷۲۴ء تا ۱۷۴۸ء) ہی کے زمانے سے اگرچہ دولت آصفیہ مغل شہنشاہیت کے تعلق سے عملاً ہر طرح آزاد خود مختار اور خود مکتفی تھی۔ تاہم شاہانِ آصفیہ ۱۸۵۷ء میں مغل حکومت کے خاتمہ تک، ہمیشہ اظہارِ عقیدت و روایت وفاداری کے طور پر اپنا ایک نمائندہ دربارِ معلّٰی میں بھیجتے رہے، پیش کش نذر کرتے رہے اور دربارِ معلّٰی سے "آصف جاہ" کا خطاب پاتے رہے۔

ان سب باتوں کے باوجود شاہ عالم ثانی کا دور ادبی نقطۂ نظر سے سنہرا دور کہلانے کا مستحق ہے کیونکہ میر تقی میرؔ، خواجہ میر دردؔ، خواجہ میر اثرؔ، انشاء اللہ خاں انشاؔ، مصحفیؔ، مرزا سوداؔ، مرزا مظہر جانِ جاناںؔ، میر ممنونؔ، نظیر اکبر آبادیؔ اور آسمانِ شاعری کے کئی آفتاب و ماہتاب اسی کے عہد میں گذرے ہیں لیکن دلی کی ابتری کے سبب ان میں سے بیشتر

www.taemeernews.com

آصف الدولہ کے یہاں لکھنو منتقل ہو گئے اور کچھ حیدرآباد چلے آئے تھے۔
مرزا غالب کی پیدائش کے تین چار سال کے اندر ہی وہ واقعہ پیش آیا جس
میں غلام قادر روہیلہ نے شاہِ عالم کے ساتھ وہ دردناک سلوک کیا جس
کو اقبال نے یوں بیان کیا ہے۔

روہیلہ کس قدر ظالم جفا جو کینہ پرور تھا
نکالیں شاہ تیموری کی آنکھیں نوکِ خنجر سے

اگرچہ مادھو راؤ سندھیا نے روہیلہ سے اس کا انتقام لے لیا لیکن یہ
ایک حقیقت ہے کہ اس واقعہ کے بعد سے مغل حکومت تو مغل حکومت
خود لال قلعہ کا وقار عوام کی نظر سے اتر گیا۔ شاہ عالم کا جانشین اکبر شاہ
بھی اسی حادثہ میں اندھا کر دیا گیا تھا۔

مرزا غالب جس مغل حکومت میں پیدا ہوئے اس میں اتنی تاب و
تواں باقی نہیں تھی کہ وہ اہلِ علم و ہنر کی سرپرستی کر سکے اور آصف الدولہ
کے بعد لکھنو میں بھی اہلِ ہنر کی قدردانی کا وہ عالم نہیں رہا۔

یہی وہ زمانہ ہے جب دکن میں نواب میر نظام علی خان
(۱۷۶۱ تا ۱۸۰۳ء) کی حکومت تھی جن کو ورثہ میں جو ریاست ملی تھی
وہ دکن کے چھ صوبوں، اورنگ آباد، خاندیس، برار، بیدر، بیجاپور اور
حیدرآباد پر مشتمل تھی۔ لیکن جنوب میں فرانسیسی اور برطانوی سامراج

www.taemeernews.com

سکے ابھرنے کی کوشش، مرہٹوں کی خواہش اقتدار اور اس صورت حال میں نوابان آرکاٹ کی سازشیں آصفجاہ ثانی کے عہد کے وہ مسائل ہیں جن سے نمٹنے میں نہ صرف آصفجاہ ثانی کا پورا عہد گذر گیا بلکہ مملکت کے کئی اضلاع انگریزوں کے حوالے ہو گئے اسی زمانہ میں موجودہ ریاست آندھرا پردیش کے اضلاع شمالی سرکار اور رائل سیما آصف جاہی علاقہ تلنگانہ سے جدا ہوئے ان ہی کے دور سے ریاست میں انگریز رزیڈنٹ اور برطانوی افواج کے دستے مستقل طور پر سلطنت آصفیہ میں مامور کیے گئے۔

نواب میر نظام علی خاں آصف جاہ ثانی کا عہد حکومت پے بہ پے جنگ اور بار بار سمجھوتوں کا ایک سلسلہ ہے۔ آصف جاہ ثانی نے انگریزوں سے جو متعدد سمجھوتے کئے تھے ان سے سلطنت آصفیہ کو فرانسیسی سازش اور دوسری علاقائی قوتوں سے اگرچہ نجات مل گئی تھی لیکن ملک میں برطانوی اثر و رسوخ اس حد تک بڑھ گیا تھا کہ ان کے جانشینوں کے لئے اس کا مقابلہ آسان نہیں تھا۔ تاہم برطانوی ہندوستان میں سلطنت آصفیہ کو ایک آئینی مقام حاصل ہو گیا تھا۔

نواب میر نظام علی خاں آصف جاہ ثانی تک انگریزوں کے تعلقات بہر حال اُن کے قابو میں تھے اور ان کے امراء بالخصوص ارسطو جاہ، صمصام الملک عبدالحی خاں، اور شمس الامراء حکومت اور نظم و نسق کے استحکام میں ان کے دست و بازو تھے۔

www.taemeernews.com

میر نظام علی خاں کے بعد وہ زمانہ آتا ہے جو دہلی میں اکبر شاہ ثانی لکھنؤ میں سعادت علی (۱۷۹۸ تا ۱۸۱۴) اور غازی الدین حیدر (۱۸۱۴ تا ۱۸۲۷) نصیر الدین حیدر (۱۸۲۷ تا ۱۸۳۷) اور حیدرآباد میں نواب سکندر جاہ آصفجاہ ثالث (۱۸۰۳ تا ۱۸۲۹) کا دور حکومت ہے یہ تمام حکومتیں حد درجہ کمزور اور اندرونی معاملات میں برطانوی دست اندازی سے ہر وقت خائف اور بے بس تھیں۔ حیدرآباد میں نواب سکندر جاہ کی تخت نشینی کے ایک سال کے اندر شیر الملک اعظم الامراء نواب ارسطو جاہ کا ۱۸۰۴ء میں انتقال ہو گیا۔ ارسطو جاہ ریاست کے وزیر اعظم اور حکومت کے رکن رکین تھے۔ انہوں نے اپنے عہدۂ وزارت عظمیٰ کے دوران اہلِ علم و ہنر کی بڑی سرپرستی کی تھی۔ ارسطو جاہ کے انتقال کے بعد وزارت عظمیٰ کے مسئلہ کو انگریزوں نے اپنے ہاتھ میں لینے کی کوشش کی اور داخلی امور میں مداخلت کرتے رہے۔ ارسطو جاہ کے بعد نواب سکندر جاہ نے نواب میر عالم کو وزیر اعظم مقرر کیا ۱۸۰۸ء میں اُن کا بھی انتقال ہو گیا۔ اب نواب سکندر جاہ اور رزیڈنٹ مسٹر رسل کے درمیان وزیر اعظم کے تقرر پر اختلاف کافی بڑھ گیا۔ اگرچہ نواب سکندر جاہ نے نواب منیر الملک کو وزیر اعظم مقرر کر دیا لیکن انگریزوں نے ایسے حالات پیدا کئے کہ منیر الملک تو نام کے وزیر اعظم رہ گئے لیکن حکومت کی حقیقی زمام اقتدار راجہ چندو لال کے ہاتھ میں رہی جو صرف

www.taemeernews.com

پیشکاری کے عہدہ پر معمور تھے۔

راجہ چندولال

راجہ چندولال ۱۱۷۵ ھجری م ۱۷۶۲ء میں پیدا ہوئے۔ راجہ ٹوڈرمل ان کے مورث اعلیٰ تھے۔ یہ کھتری قوم سے تعلق رکھتے تھے۔ اِن کے جدِ امجد رائے مول چند آصف جاہ اول کی ہمرکابی میں دکن آئے تھے۔ راجہ چندولال کم سنی میں یتیم ہو گئے تھے۔ سن شعور کو پہونچنے کے بعد شمشیر جنگ اور بدیع اللہ خاں کمشنر کروڑگری کی ماتحتی میں کام کرتے رہے۔ پھر ترقی کر کے سبزی منڈی کی محرری پر مامور ہوئے اور صبح سے شام تک منڈی میں بیٹھے رہتے تھے۔ اُس کے بعد بیلی کے عہدے پر ترقی کی۔ ۱۷۹۷ء میں شمشیر جنگ نے انھیں اپنے تعلقہ موروثی کی کارپردازی پر مقرر کروایا اور اسی سال مشیر الملک بہادر کی تحریک پر دربار آصفیہ سے یہ قلعہ سدوٹ، موضع کریہ اور کانجی کوٹہ وغیرہ کے انتظام کیلئے چار ہزار سوار اور چار ہزار پیدل کے ساتھ مامور کئے گئے اور راجہ بہادر کا خطاب پایا۔ اس مہم سے واپسی کے بعد شمس الامرار کی جمعیت پائیگاہ ان کے تفویض کی گئی۔ ان خدمات کو انہوں نے کمال حسن وخوبی کے ساتھ انجام دیا۔ جس کی وجہ سے میر عالم بہادر وزیر مملکت آصفیہ کی نگاہوں میں ان کا مقام بڑھ گیا۔ کچھ ہی دنوں کے بعد سکندر جاہ

www.taemeernews.com

بہادر نے ان کی قابلیت سے آگاہ ہو کر افواج آصفیہ کا پیش کار مقرر فرمایا۔

۱۲۳۵ھ (۱۸۲۰ - ۱۸۱۹) میں نواب سکندر جاہ بہادر نے ان کو مہاراجہ کا خطاب دے کر نوبت اور جھالر دار پالکی سے سرفراز فرمایا۔ اور اس کے علاوہ ایک کروڑ روپیہ نقد عطا فرمایا ۱۲۳۷ھ م ۱۸۲۲ء میں ہفت ہزاری منصب سے سرفراز کیا۔ نواب منیر الملک کے انتقال کے بعد مہاراجہ چندو لال وزارت عظمیٰ پر سرفراز کیے گئے۔ ۱۲۶۰ھ م ۱۸۴۴ء میں ملازمت سے مستعفی ہوئے اور ۱۲۶۱ھ م ۱۸۴۵ء میں ۸۶ برس کی عمر میں انتقال کیا۔

مہاراجہ چندو لال کو انگریزوں کی تائید کی وجہ سے ایسا مقام حاصل ہو گیا تھا کہ وزیر اعظم امور نظم و نسق سے تقریباً بے دخل تھا اور سوائے دستخط کے عملاً اسے کوئی اختیار نہ تھا۔ نواب سکندر جاہ بھی بالکل بے اختیار ہو گئے تھے۔ اور انھوں نے ان حالات سے متاثر ہو کر محل سے نکلنا چھوڑ دیا تھا[1] بعض اوقات چار چار سال تک انھوں نے قدم باہر نہیں نکالا۔ ۱۸۲۹ء میں نواب سکندر جاہ کا انتقال

---

[1] تاریخ ریاست حیدرآباد دکن از محمد نجم الغنی خاں مطبوعہ نولکشور لکھنؤ ۱۹۳۰ء

www.taemeernews.com

ہو گیا اور نواب میر فرخندہ علی خاں ناصر الدولہ آصف جاہ رابع تخت نشین ہوئے۔ ۱۸۳۲ء میں نواب منیر الملک وزیر اعظم کا انتقال ہو گیا اور راجہ چندو لال وزیر اعظم مقرر ہو گئے۔ راجہ چندو لال کے اوصاف میں جس چیز نے نظم و نسق اور تہذیب دونوں کو متاثر کیا وہ اُن کا جود و سخا تھا۔ اُن کی فراخ دستی اس حد کو پہونچی ہوئی تھی کہ نہ صرف مختلف تیوہاروں اور تقاریب پر وہ بے دریغ روپیہ صرف کر دیتے بلکہ ہر روز ان کے داد و دہش کا یہ عالم رہتا کہ بقول نجم الغنی مثنوی سحر البیان کے واقعات اس کے آگے پھیکے پڑ جاتے تھے۔ حکیموں، شاعروں، مرثیہ خوانوں، سوز خوانوں اور ارباب نشاط و طرب کو ہزاروں روپیے انعام میں دیتے اور ان کی تنخواہیں اس کے سوا ہوتی تھیں۔ راجہ چندو لال نے حیدرآباد میں بہت سی خوبصورت و بیش قیمت عمارتیں بنوائیں۔ اس فیاضی کے اثر سے اہل ہنر تو مستفید ہوئے لیکن اس کا بار حکومت کے خزانہ پر پڑا۔ چندو لال خود بھی شاعر و ادیب تھے اور اہل ہنر کے قدر داں تھے۔

راجہ چندو لال اُردو اور فارسی کے اچھے شاعر تھے ان کا یہ معمول تھا کہ ہر رات کئی گھنٹے اہل علم کی مجلس آراستہ کرتے جس میں شعر و سخن اور مسائل تصوف کا چرچا ہوتا۔ اس دور کے شعراء میں مولوی ابو تراب، مولوی محمد حسین، مولوی غلام حسین حفیظ دہلوی، فائز، حاجی محمد علی ساغر،

www.taemeernews.com

مرزا محمد طاہر تبریزی، حسین علی خاں ایسار، تاج الدین مشتاق، ذوالفقار علیخاں صفا، میر عنایت علی ہمت، احمد علی شہید، ظہور اکرم، میر مفتون وغیرہ قابل ذکر شعرا گذرے ہیں۔ ان میں سے بعض صرف فارسی کے شعرا رہیں اور بعض صرف اردو کے۔ استاد ذوق، شاہ نصیر اور ان کے بھائی شاہ حفیظ الٰہی کی طلب پر حیدرآباد آئے تھے۔ دہلی سے استاد ذوق اور لکھنؤ سے استاد ناسخ کو بھی انہوں نے حیدرآباد آنے کی دعوت دی تھی۔ مگر ذوق نے یہ شعر لکھ کر معذرت چاہی۔

گرچہ ہے ملک دکن میں آج کل قدر سخن
کون جائے ذوق پر دلی کی گلیاں چھوڑ کر

شاہان کے دور میں دکن میں قدیم دبستان سخن کی سرپرستی ختم ہو رہی تھی۔ ان کے بعد مختار الملک سر سالار جنگ نے ان اہل علم اور ادیبوں کو حیدرآباد بلایا جو عموماً علیگڈھ تحریک کے رفیقوں میں تھے اور اردو ادب کے ایک نئے مستقبل کے نقیب تھے۔

نواب ناصر الدولہ کا دور بہادر شاہ ثانی کے دور کے متوازی ہے۔ ان دونوں کے ادوار ۱۸۵۷ء میں ختم ہوتے ہیں۔ نواب ناصر الدولہ کا دور نہ صرف حیدرآباد بلکہ پورے ہندوستان میں عظیم تبدیلیوں کا دور ہے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب نظم و نسق طرز حکومت، عدالت، آئین، تعلیم اور

www.taemeernews.com

صحافت سب ہی نئے مغربی طرز سے متاثر ہو رہے تھے۔ درحقیقت ہندوستان میں عصر نو طلوع ہو رہا تھا۔ جاگیرداری نظام ختم نہیں ہوا تھا لیکن مذکورہ بالا ادارے آمرانہ نظام کی گرفت سے نکل رہے تھے اور ان میں جمہوری اور علمی اوصاف کو فروغ حاصل ہو رہا تھا۔ چنانچہ ملک کے مختلف حصوں میں عصر نو کے پیامبر ابھر رہے تھے ایسے قائدین میں شمالی ہند میں سرسید احمد خاں اور جنوب میں مختار الملک سر سالار جنگ اول قابل ذکر ہیں ۔ دونوں نے زمانے کے رخ کو پہچانا۔ تغیرات کا استقبال کیا اور ملک و ملت کی تشکیل نو کی عظیم مہم میں مصروف ہو گئے۔ نواب ناصر الدولہ کے عہد کا سب سے اہم واقعہ سر سالار جنگ اول کا عہدہ وزارت عظمیٰ پر مامور ہونا ہے۔ سرسید کی طرح سر سالار جنگ نے ملک کی اصلاح کے لئے انگلستان جا کر نئے حالات کا مطالعہ کیا۔ انگریزی سے ان کو پوری طرح واقفیت تھی۔ ساتھ ہی ساتھ سرسید کے ایک رفیق خاص تھے اور تقریباً پالیسی کے تمام امور میں سرسید سے مشورہ کیا کرتے تھے۔ یہ سر سالار جنگ ہی تھے جنہوں نے نواب محسن الملک، نواب وقار الملک، نواب اعظم یار جنگ، مولوی نذیر احمد، مولوی سید علی بلگرامی، نواب عماد الملک، جیسی شخصیتوں کو حیدرآباد بلالیا۔ ان میں سے بیشتر وہ ہیں جو نہ صرف سرسید سے فیض اٹھائے ہوئے ہیں بلکہ

www.taemeernews.com

اُن کی تحریک کے وابستگان میں سے ہیں۔ سر سالار جنگ نے قدیم طرز کے نظم و نسق کو بدل کر نئی وضع کے محکمہ اور تنخواہ یاب عہدے قائم کئے۔ جن میں محکمہ تعلیمات اور جدید طرز کے مدرسوں کا ریاست بھر میں قیام ٹیچرس ٹریننگ کالج، انجنیرنگ اور میڈیکل کالج، اور ریاست بھر میں دواخانوں کا قیام قابل ذکر ہے۔ ریاست حیدرآباد میں ریلیں بھی سر سالار جنگ کی کوششوں سے بچھائی گئیں مجلس مال قائم کر کے انہوں نے مالگزاری کے انتظام میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ سالار جنگ ۱۸۵۳ء میں وزیر اعظم مقرر ہوئے۔

یہ ایک دلچسپ عمرانی حقیقت ہے کہ جب کسی تہذیب میں نئی اقدار کے علمبردار اٹھتے ہیں تو رجعت پسند اقدار کے علمبرداروں سے اُن کو متصادم ہونا پڑتا ہے۔ سر سالار جنگ نے کامیابی کے ساتھ ایسے تصادم کا مقابلہ کیا۔ سالار جنگ کی سب سے اہم کشاکش جاگیردار طبقہ سے رہی ہے۔ حیدرآباد کے نظام جاگیرداری میں پائیگاہوں کو سب سے بڑا مقام حاصل رہا ہے۔ امرائے پائیگاہ خاندان آصفی کے رشتہ دار تھے جو آصف جاہ اول کے زمانہ سے اعلیٰ خطابات اور مناصب جلیلہ پر فائز ہے۔

حیدرآباد کی تہذیبی زندگی کی ترقی میں پائیگاہوں کا بھی بڑا اہم

www.taemeernews.com

حصہ رہا ہے۔ یہاں کی پائیگاہوں کے امیر شمس الامرا امیر کبیر کے خطابات سے نوازے جاتے رہے ہیں۔ حکومت کے مہم امور میں امرائے پائیگاہ اور دیوان دونوں کی بڑی اہمیت تھی۔ یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ یہ دونوں مرزا غالب کے ممدوح رہے ہیں۔ اس موقع پر پائیگاہ کا کسی قدر تفصیلی تعارف بے محل نہ ہوگا۔

میر ابوالفتح خاں جن کو ابوالخیر خاں تیغ جنگ شمس الدولہ شمس الملک شمس الامرا اول کے خطابات سے بھی یاد کیا جاتا ہے نواب آصف جاہ اول کے ساتھ دکن آئے تھے۔ انہوں نے دلاور علی خاں بخشی اور مرہٹوں کے خلاف جنگ میں آصف جاہ اول کا ساتھ دیا۔ آصف جاہ اول کے بعد نواب میر نظام علی خاں آصف جاہِ ثانی نے بھی ان کی بڑی قدر کی اور حکومت کے تمام اہم مسائل میں ان سے مشورہ کیا کرتے تھے۔ اُن کے بیٹے محمد فخر الدین خاں، امام جنگ، تیغ جنگ، خورشید الدولہ شمس الدولہ، خورشید الملک، شمس الملک، شمس الامرا دوم، امیر کبیر اول (۱۷۸۱ تا ۱۸۶۳) والیٔ پائیگاہ مقرر ہوئے جن کی حیثیت حکمران کے بعد سب سے بڑی ہوتی تھی۔ نواب فخر الدین خان کے بعد ان کے بیٹے نواب رفیع الدین خاں (۱۸۰۵ تا ۱۸۷۷) اس کے بعد ان کے بھائی نواب رشید الدین خاں (۱۸۷۵ تا ۱۸۸۱) تمام تر خطابات کے

www.taemeernews.com

ساتھ امیر کبیر شمس الامراء والیٔ پائیگاہ قرار پائے۔ بعد کو پائیگا کی جاگیریں تین مختلف پائیگاہوں میں تقسیم ہوگئیں۔

نواب ناصر الدولہ کا انتقال ۱۸۵۷ء میں ہوگیا اور نواب افضل الدولہ بہادر آصف جاہ خامس تخت نشین ہوئے۔ نواب افضل الدولہ کے دور میں سر سالار جنگ کی اصلاحی کوششیں زیادہ تیز ہوگئیں نواب افضل الدولہ کا دور اس وقت سے شروع ہوتا ہے جب دلّی میں بہادر شاہ ظفر اور لکھنؤ میں واجد علی شاہ کی حکومتیں ختم ہو چکی تھیں اور حیدرآباد اہل دہلی اور اہل لکھنؤ کی امیدوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ دراصل یہی وہ زمانہ ہے جب شمالی ہند کے شرفا اور اہل علم و ہنر کثیر تعداد میں دکن منتقل ہونا شروع ہوگئے تھے اور یہاں پر اعلیٰ عہدوں سے سرفراز ہوئے۔

اب سلطنت آصفیہ کے روابط مرکز میں مغلوں کے بجائے انگریزوں سے قائم ہوگئے۔ سر سالار جنگ نے نظام برطانوی روابط کو بڑی دانشمندی سے مستحکم کیا اس زمانے میں مرزا غالب جن مصائب سے دوچار تھے ان کا حیدرآباد کی طرف دیکھنا عین فطری ہے۔ چنانچہ نواب افضل الدولہ آصف جاہ خامس وہ واحد آصف جاہی حکمران ہیں جو غالب کے ممدوح بھی ہیں افضل الدولہ کا انتقال اسی سال ہوتا ہے جس سال مرزا غالب کا انتقال ہوا۔ اس طرح نواب افضل الدولہ آصف جاہ خامس کے عہد حکومت پر عہد غالب کے حیدرآباد کا اختتام ہوتا ہے۔

www.taemeernews.com

حیدرآباد پس از غالب
(۱۸۶۹ تا ۱۹۶۹)

اِن سطور کے لکھتے وقت مرزا غالب کی وفات کو سو برس گذر چکے ہیں۔ ان سو برسوں میں حیدرآباد جن تہذیبی اور سیاسی تغیرات سے گذرا وہ داستان در داستان ہے مرزا غالب کے بعد دہلی اور لکھنو کی تہذیب کے ٹکڑے رام پور، کلکتہ، بھوپال، جے پور اور کہاں کہاں بکھر گئے۔ لیکن ان کا سب سے بڑا حصہ حیدرآباد کے نصیب میں آیا۔ اس سے پہلے کہ اس تہذیبی، علمی اور ادبی ماحول کا جائزہ لیا جائے یہ وضاحت ضروری ہے کہ اس ایک صدی کا ماحول مختلف ادوار میں منقسم ہے۔ اور یہ تقسیم بالعموم سیاسی ادوار پر مبنی ہے۔

۱۸۶۹ تا ۱۹۱۱ء

یہ دور نواب میر محبوب علی خاں آصف جاہ سادس کا ہے۔ ان کے

www.taemeernews.com

دورِ حکومت میں مختار الملک سر سالار جنگ اول (وفات ۱۸۸۳)
کی اصلاحی کوششوں کو غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی۔ اس کے بعد
ان کے بیٹے لائق علی خاں سالار جنگ دوم (وفات ۱۸۸۶) نے ان
کی اسکیموں کو آگے بڑھانے کی پوری پوری کوشش کی۔ اس وقت تک
ریاست میں نظم و نسق اور تعلیم کی زبان فارسی تھی۔ سر سالار جنگ
نے محسوس کیا کہ اس دور میں نظم و نسق کی ادنیٰ کارکردگی کا ایک اہم سبب
فارسی زبان ہے جس پر یہاں کے لوگوں کو مناسب قدرت باقی
نہیں رہی تھی۔ دوسرے وہ فارسی جدید تقاضوں کی مکلف نہیں
ہو سکتی تھی۔ لہٰذا آصف سادس نے اُردو زبان کو نظم و نسق و تعلیم کا
ذریعہ قرار دیا۔

۱۸۹۲ء میں قانونچہ مبارک کے ذریعہ ریاست کو دستوری شکل
دی گئی۔ عدلیہ اور مقننہ کو جدا کیا گیا۔ سر سید کے مشورہ سے سر سالار جنگ
نے حیدرآباد میں سیول سروس قائم کرنے کی جو تجویز پیش کی تھی وہ
روبہ عمل لائی گئی اور بالخصوص جامعہ علیگڈھ سے نہایت لائق افراد
کو اہم عہدوں پر مامور کیا گیا۔ اس دور کی حکومت میں نواب وقار الملک
نواب محسن الملک، نواب اعظم یار جنگ، نواب فریدون الملک،
مہاراجہ کشن پرشاد، سر امین جنگ، میر افضل حسین، مولوی عزیز مرزا،

www.taemeernews.com

مولوی بشیر الدین احمد خاں، ناظم نظم جمعیت، مولوی، نذیر احمد جیسے لائق افراد موجود تھے۔ جن میں سے بیشتر شمالی ہند سے آئے ہوئے تھے اور تقریباً سب ہی شیدائیانِ غالب تھے، یہ افراد ایک طرف تو ملک و قوم کو نئے قالب میں ڈھال رہے تھے اور دوسری طرف شاعر فردا مرزا غالب کو نئی نسل سے روشناس کرا رہے تھے۔ ان اصحاب کی وجہ سے حیدرآباد میں غالبیات کو جو فروغ حاصل ہوا اس کا ذکر آگے آئے گا۔ یہ تو محض نظم حکومت کی شکل تھی لیکن یہ دور اپنے تہذیبی تغیرات کے اعتبار سے خاص طور پر اہم ہے۔ اس زمانے تک حیدرآباد کی تہذیب پر شمالی ہند کی تہذیب کا اثر ایسا کبھی نہیں پڑا تھا جیسا اس وقت پڑا۔ بالخصوص یہاں کی ادبیات دلی اور لکھنو کی ٹکسال کو تسلیم کر چکی تھیں۔ علاقائی اُردو جو کسی زمانے میں دکنی رہی ہوگی، اپنا مزاج بدل چکی تھی۔ اس دور کی اُردو کو جو کم و بیش دوسری جنگ عظیم تک باقی رہی حیدرآبادی اُردو کہا جا سکتا ہے۔ اہل علم اور اہل قلم بولتے تو حیدرآبادی اُردو تھے لیکن لکھنے میں دہلی یا لکھنو کی اتباع کرتے تھے۔ ملک الشعرا یا تو فصیح الملک مرزا داغ تھے یا مولوی امیر مینائی اس زمانے میں دہلی اور لکھنو سے اساتذۂ سخن کے جو باکمال شاگرد حیدرآباد آئے اُن سے دبستان دہلی و لکھنو کی یہاں ایک ایسی

www.taemeernews.com

فضا قائم ہوگئی جو کبھی ٹھیٹ لکھنوی سلسلوں پر مشتمل رہی تو کبھی ٹھیٹ دہلوی سلسلوں پر اور پھر ان کی آمیزش سے شعر و سخن میں دہلی اور لکھنو کی ایک گنگا جمنی بنتی گئی جو حیدرآباد کی ادبی زبان کا ایک وصفِ خاص ہے۔

یہاں پر شاہ نصیر، خواجہ میر درد، ذوق، داغ اور ظہیر دہلوی کے سلسلۂ تلمذ سے دہلی کا رنگ ایک طرف قائم تھا تو دوسری طرف مصحفی، امیر، امیر، آتش اور ناسخ، رشک اور قدر، حبیب اور منتہی کے سلسلہ ہائے تلمذ سے لکھنو کا رنگ جما ہوا تھا۔ پھر تلمذ کے کئی ایسے سلسلہ ہیں جو مشترک ہیں۔ یہاں شاگردانِ غالب کا ذکر نہیں کیا گیا کیونکہ آگے تفصیل سے اس کا جائزہ لیا جائے گا۔ اس دور میں حیدرآباد میں غالب کے کئی شاگرد ہوئے ہیں اور کئی باہر سے آئے ہیں، ان کے علاوہ خانوادۂ غالب کے کئی افراد نے یہاں آکر سکونت اختیار کرلی۔

حیدرآباد کی علمی ادبی محفلوں میں غالب موضوع بحث ہوا کرتے تھے اور یہ بحثیں بعض اوقات سخت و شدید بھی ہوئی ہیں، طرفدارانِ غالب کی تعداد بھی کافی تھی اور اُن کی منزلت بھی اونچی تھی۔ یہی وہ دور ہے جب حیدرآباد میں غالب فہمی کی کوششیں شروع ہوئیں۔ کلامِ غالب کی شرحیں لکھی گئیں۔ ان کے کلام پر مناظرے اور مباحثے ہوئے

www.taemeernews.com

اور تنقیدات غالب کا آغاز ہوا ساتھ ہی ساتھ غالبیات کو حیدرآباد کے بعض کالجوں کے نصاب میں بھی داخل کیا گیا۔

غالب کا نام حیدرآباد میں اور اس کے دور دراز اضلاع و تعلقات میں بھی معروف و مقبول تھا۔ ہنگامہ غدر سے بچ کر غالب کے بعض رشتہ دار جب حیدرآباد آئے ہیں تو انہیں غالب کے نام سے اپنا تعارف کرانے میں نہ صرف سہولت ہوئی بلکہ ان کی قدر و عزت بھی ہوئی۔ نواب سرور الملک نے غدر کے بعد جب حیدرآباد کا رخ کیا تو اپنے حالات سفر میں کئی ضمنی واقعات بیان کئے ہیں جو علمی حیثیت سے اہم ہوں یا نہ ہوں لیکن اس لحاظ سے ضرور اہم ہیں کہ اس زمانے میں غالب یہاں کس قدر متعارف اور کس قدر مقبول تھے۔ یہاں ان کے حالاتِ سفر دکن سے بعض اقتباسات دیئے جاتے ہیں۔

"ایک اور بزرگوار فرد کش تھے، نام انکا مرزا عبدالرحیم بیگ تھا۔ سفید تکا داڑھی تا بہ ناف، لمبا قد گندم رنگ بیٹھے ستار بجا رہے تھے.... مجھ سے کہا کہ دیکھئے کیا اتفاق ہے آپ بھی مغل میں بھی مغل۔ آپ بھی سرپور جا رہے ہیں اور میرا منزل مقصود بھی

www.taemeernews.com

دہی ہے مجھ کو بھی ایک گاڑی منگوا دیجئے تو خوب گذرے گی
جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو! الغرض گاڑی منگوا دی گئی اور
ہم دونوں ہم سفر و ہم صفیر ہو گئے اس طرح ایک مقام موسوم بہ
ہینگن گھاٹ پر پہونچے... ایک درخت کے سایہ کے نیچے قیام کیا۔ اور
غالب کا شعر پڑھ کر طالب شرح ہوئے۔"

ملنا ترا اگر نہیں ہے آساں تو سہل ہے
دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

میں نے معنی بیان کرنے شروع کر دیئے، ادھر ایک جوان
آدمی دھوتی باندھے، صرف ایک کرتہ پہنے درخت کی شاخ
پکڑے ہوئے بغور معنی سن رہا تھا اس وقت تک تو کچھ خیال
نہ تھا جب وہ آگے بڑھے اور دری پر بیٹھنے کی اجازت مانگی
تو میں سمجھا کوئی پنڈت یا کایستھ ہوں گے، وہ دری پر بیٹھ گئے
اور ایک دو شعر غالب کے پڑھ کر تشریح کے طالب ہوئے۔
مجھ کو نہایت حیرت ہوئی۔ مگر میں نے معنی بیان کرنے
شروع کر دیئے، عبدالرحیم بیگ چپکے سے اُٹھ کر ایک طرف
گئے اور وہاں سے آکر میرے کان میں کہا کہ یہ یہاں کے تحصیلدار
ہیں۔ بعدہٗ ان سے کہا، تحصیلدار صاحب یہ جوان مسافر

www.taemeernews.com

مرزا اسداللہ خاں غالب کے پوتے ہیں۔ تحصیلدار صاحب
کھڑے ہو گئے اور کہا کہ میں بذریعہ رسل و رسائل ان کا شاگرد
ہوں اور خوب دبوچ کر مجھ سے گلے ملے۔ اور کہا چلئے یہ
سامنے دروازہ میرے مکان کا ہے۔..... تحصیل دار صاحب
نے بہت ہی نفیس دعوت کی "

سرور الملک (کارنامۂ سروری صفحہ ۶۷)

سرور الملک کے بیان کا جائزہ اگر ان کے دوسرے بیانوں کی روشنی میں لیا جائے تو یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب مرزا غالب بقید حیات تھے۔ اس سے غالب کی مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے کہ ریاست حیدرآباد میں اہل ذوق شہروں اور دیہاتوں میں نیز سفر و حضر میں مرزا کے شعر سننے اور سمجھنے کے مشتاق رہتے تھے۔

یہ بات بادی النظر میں خلاف واقعہ محسوس ہوتی ہے لیکن حیدرآباد میں غالب سے جو عقیدت کا عالم رہا ہے اس کے پیش نظر اس پر یقین کرنا پڑتا ہے۔

غالب کے حیدرآبادی شاگرد حبیب اللہ ذکا غالب سے اس وقت متاثر ہوئے ہیں جب غالب کی وفات سے برسوں پہلے وہ موجودہ آندھرا پردیش کے ضلع نیلور کے ایک چھوٹے سے مقام اودگیر

www.taemeernews.com

میں رہتے تھے اور غالب سے ملنے کی آرزو میں وہ اودگیر سے پیدل حیدرآباد آئے تاکہ یہاں پہونچ کر ملاقات کی سبیل نکالی جائے۔ خود مرزا غالب کو ذکا کی عقیدت پر حیرت ہوئی تھی۔

"بھائی میں نہیں جانتا کہ تم کو مجھ سے اتنی ارادت اور مجھ کو تم سے اتنی محبت کیوں ہے، ظاہرا معاملہ ارواح ہے اسباب ظاہری کو اس میں دخل نہیں۔"

(مکتوب غالب بنام حبیب اللہ ذکا ۱۵۔ فروری ۱۸۶۷ء)

اہل ذوق شعر غالب کی عقدہ کشائی کے لیے مشتاق رہتے تھے اور اہل علم کالجوں میں غالب کی تدریس کے لئے موزوں اساتذہ کے نام تجویز کرتے تھے، نظام کالج کے ایک اُستاد ۱۸۹۵ء سے پہلے اس معاملہ میں نظام کالج کے پرنسپل کو حسب ذیل خط لکھتے ہیں:

جناب پرنسپل صاحب نظام کالج سرکار عالی

آب حیات و دیوان غالب سینیر بی۔ اے اور جونیر بی۔ اے کے لئے اس سال ٹکسٹ مقرر ہو رہی ہیں اور یہ کتابیں تدریس و ترتیب سوالات امتحانی کے واسطے مدرسہ میں موجود نہیں ہے اگر اجازت ہو تو شہر کے کتب فروشوں کی دوکان سے فراہم

لہ اردو معلی مطبوعہ مطبع مجتبائی دہلی ۱۸۹۹ء

www.taemeernews.com

کی جائیں - ہر دو نسخوں کی قیمت تقریباً تین روپئے ہوگی دیگر

عرض یہ ہے کہ سینیر بی-اے اور جونیر بی - اے کی تدریس اس

ہیچداں سے متعلق رہے - ان دونوں درجوں کا نصاب اُردو

ہے لہذا اگران کے ممتحنین میر حیدر علی صاحب و مولوی صدیق حسن

صاحب ہوں تو بہت اچھا ہوگا' اطلاعاً گذارش کی جاتی ہے۔

(ترجمہ رقعہ عبدالعلی والہ گلستان نثر صنا۲)

غالب کے طرفدار اس زمانے میں بالعموم حضراتِ دہلی کے نام سے یاد کیے جاتے تھے لیکن حیدرآباد میں جو حضراتِ لکھنو سے تھے جن میں پنڈت رتن ناتھ سرشار، مرزا محمد ہادی رسوا، علی حیدر نظم طباطبائی وغیرہ شامل ہیں' ان کا غالب سے لگاؤ اردو ادب کے طالب علموں سے پوشیدہ نہیں ہے۔ مہاراجہ کشن پرشاد اگرچہ شعر میں نظم طباطبائی اور نثر میں پنڈت رتن ناتھ سرشار سے استفادہ کرتے تھے لیکن آئین مکتوب نگاری میں مرزا کی اردوئے معلیٰ کی پیروی کی کوشش کرتے تھے۔ نواب عماد الملک اور سرراس مسعود نے غالب کی شرحیں لکھوانے کی طرف خصوصی توجہ دی - اس دور کے حیدرآباد کے ادبی ماحول کو ان شخصیتوں کے علاوہ جو یہاں مقیم تھیں مرزا غالب کے اہم ترین شاگرد مولانا حالی اور رفقاء سرسید میں مولانا ذکا اللہ اور

www.taemeernews.com

مولانا شبلی نعمانی کے گاہ بہ گاہ دوروں سے رونقِ تازہ ملتی رہی۔

۱۹۱۱ء تا ۱۹۴۸ء

۱۹۱۱ء میں نواب میر عثمان علی خاں آصف جاہِ سابع تخت نشین ہوئے۔ آصفِ سابع کی شخصیت غیر معمولی اور متنوع اوصاف کی حامل تھی۔ آصفِ سابع نے نہ صرف اپنے پیش روؤں کی طرح حکمران کی حیثیت سے زندگی گذاری، بلکہ امورِ نظم و نسق میں ایک عرصہ تک وزیرِ اعظم کے فرائض بھی انجام دیتے رہے۔ اس کے علاوہ آصفِ سابع حیدرآباد کے ایک جمہوری قائد، ایک مصلح اور تہذیب کے مجدد کی حیثیت رکھتے تھے۔ اس بادشاہ نے درویشوں کی سی سادہ زندگی گذاری، اور اپنے آپ کو ہمیشہ "خادمِ ملک و ملت" کہا اور ایک مخلص قائد کی طرح مستقبل آفریں اقدار پر نئے حیدرآباد کی تشکیل میں اس سرگرمی اور تندہی سے مصروف ہو گیا کہ اس کی مثال ہم کو بادشاہوں کی نہیں بلکہ قائدین ہی کی زندگی میں مل سکتی ہے۔

آصف سابع کے دور میں عدالت، نظم و نسق، مقننہ، تعلیم، صحت عامہ، تعمیرات عامہ اور صحافت کو نہ صرف ترقی ہوئی بلکہ ان کو سائنٹیفک کردار بھی ملا۔ اس زمانے میں ہندوستان کے بہترین دماغ

www.taemeernews.com

حیدرآباد میں اس درویش صفت بادشاہ کے اطراف اکٹھا ہو گئے تھے اور اپنی بہترین توانائیوں سے ملک کی تعمیر و تشکیل میں مصروف تھے۔ نواب میر محبوب علی خاں آصف سادس کے عہد حکومت کی وہ عظیم شخصیتیں جن کا ذکر ہم اوپر کر آئے ہیں وہ تو موجود تھیں ہی، ان کے علاوہ سر اکبر حیدری، سر علی امام، سر مرزا اسمعیل، مسٹر وشیشوریا، مولوی وحید الزماں، نواب احمد سعید چھتاری، مولوی حبیب الرحمٰن شروانی صدر یار جنگ اور دوسری کئی اہم شخصیتوں نے نئے حیدرآباد کی تعمیر میں ہاتھ بٹایا۔

آصفِ سابع کے عہد کے ایسے چند نمایاں کارناموں تک اس وقت ہماری گفتگو محدود رہے گی جن کا اثر حیدرآباد کی علمی فضا پر پڑا جس میں غالبیات کو فروغ حاصل ہوا۔

ایسے کارناموں میں سرِ فہرست جامعہ عثمانیہ کا قیام ہے۔ جامعہ عثمانیہ ہندوستان کی پہلی جامعہ ہے جہاں تمام شعبہ ہائے علوم میں یونیورسٹی کے اعلیٰ درجوں تک اُردو کو ذریعہ تعلیم رکھا گیا۔ یہ جامعہ ۱۹۱۹ء میں قائم کی گئی۔ جس کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ ملکی زبان میں تعلیم کی سہولت فراہم کی جائے تاکہ نئی نسلوں کی بہتر سے بہتر جسمانی اور روحانی تربیت ہو سکے۔ خود آصفِ سابع نے جامعہ کے مقاصد اس طرح بیان کئے ہیں۔

www.taemeernews.com

"ممالکِ محروسہ کے لئے ایک ایسی یونیورسٹی قائم کی جائے جس سے قدیم مشرقی اور مغربی علوم کا امتزاج اس طور سے کیا جائے کہ موجودہ تعلیم کے نقائص دور ہو کر جسمانی، دماغی اور روحانی تعلیم کے قدیم وجدید طریقوں کی خوبیوں سے پورا پورا فائدہ حاصل ہو سکے، اور جس میں علم پھیلانے کی کوشش کے ساتھ ساتھ ایک طرح طلبا کے اخلاق کی درستگی کی نگرانی ہو اور دوسری طرف تمام علمی شعبوں میں اعلیٰ درجہ کی تحقیق کا کام بھی جاری رہے۔

اس یونیورسٹی کا اصل اصول یہ ہونا چاہیئے کہ اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ ہماری زبان اُردو قرار دی جائے اور انگریزی زبان کی تعلیم بھی بہ حیثیت ایک زبان کے ہر طالب علم پر لازمی گردانی جائے۔ لہٰذا میں بہت خوشی کے ساتھ اجازت دیتا ہوں کہ میری تخت نشینی کی یادگار میں حسبِ مذکور اصول بحوالہ عرضداشت کے موافق ممالک محروسہ کے لئے حیدرآباد میں یونیورسٹی قائم کرنے کی کارروائی شروع کی جائے۔ اس یونیورسٹی کا نام "عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد" ہوگا۔"

جامعہ عثمانیہ کے معماروں میں سر اکبر حیدری، نواب ذوالقدر جنگ، نواب مہدی یار جنگ، قاضی محمد حسین اور عبدالستار صدیقی کے نام ہیں۔

www.taemeernews.com

جامعہ عثمانیہ کے ابتدائی اساتذہ میں عبدالرحمٰن خاں، عبدالستار صدیقی، وحیدالدین سلیم، خلیفہ عبدالحکیم، مولانا محمد عبدالقدیر صدیقی، ڈاکٹر سید عبداللطیف، پروفیسر ہارون خان شیروانی، پروفیسر حبیب الرحمٰن اور ان کے بعد بابائے اُردو مولوی عبدالحق، مولانا مناظر احسن گیلانی، ڈاکٹر یوسف حسین خاں، ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور، پروفیسر عبدالقادر سروری، ڈاکٹر ظہیرالدین الجامعی، ڈاکٹر رضی الدین صدیقی، ڈاکٹر میر ولی الدین، آغا حیدر حسن، ابوظفر عبدالواحد، عبدالقیوم باقی، رقیہ بیگم اور جہاں بانو نقوی کے نام قابل ذکر ہیں۔ محکمہ تعلیمات اور دیگر محکموں سے وابستہ اہل علم پروفیسر سید علی اکبر، سجاد مرزا، عظمت اللہ خاں، فانی بدایونی، قاضی عبدالغفار، اور مرزا فرحت اللہ بیگ حیدرآباد کے علمی اور ادبی ماحول کی تعمیر میں اپنا حصہ ادا کر گئے۔ اس کے بعد ان اساتذہ کا دور آیا جو مذکورہ بالا بزرگوں کی تربیت سے فیض یافتہ تھے اور یہی شخصیتیں موجودہ حیدرآباد کے ادبی ماحول کی آبرو ہیں۔ اوپر جن اساتذہ کا ذکر کیا گیا ہے ان میں سے کئی ایسے ہیں جنہوں نے "غالبیات" کے ارتقا میں اہم خدمت انجام دی ہے۔ اور دوسروں نے اس علمی اور ادبی ماحول کو فروغ دیا جس میں غالب فہمی کو نشوونما حاصل ہوئی۔

جامعہ عثمانیہ کے بعد دوسرا اہم ادارہ دارالترجمہ تھا۔ اس ادارہ کا

www.taemeernews.com

مقصد یہ تھا کہ جامعہ عثمانیہ کے مختلف شعبوں میں اردو ذریعۂ تعلیم کو کامیاب بنانے کے لئے مختلف علوم وفنون کی کتابوں کا اُردو میں ترجمہ کیا جائے۔ یہ دارالترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام سے پہلے ہی قائم کیا جاچکا تھا۔ اپنے مقصد کے حصول میں دارالترجمہ کا تجربہ نہایت کامیاب رہا۔ اس دارالترجمہ سے جو لوگ وابستہ رہے ہیں ان میں عبداللہ عمادی، عبدالستار صدیقی، عنایت اللہ، الیاس برنی، ظفر علی خاں عبدالماجد دریابادی، مرزا محمد ہادی رسوا، سید ہاشمی فرید آبادی، علی حیدر نظم طباطبائی، رائے جانکی پرشاد، جوش ملیح آبادی، اور ڈاکٹر نظام الدین کے نام قابل ذکر ہیں۔ دارالترجمہ میں جو علمی کام ہوا اس سے قطع نظر یہ بات مزید اہمیت کی حامل ہے کہ اس ادارہ کی وجہ سے حیدرآباد کے علمی وادبی ماحول کو ایسی شخصیتوں سے رونق نصیب ہوئی جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ اصحاب دارالترجمہ کی اس مختصر سی فہرست سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ان میں دلدادگانِ غالب کتنے تھے۔

حیدرآباد کا یہ ادبی ماحول تقسیم ہند کے بعد یک لخت بدل گیا اور ۱۹۵۶ء میں لسانی ریاستوں کی تشکیل جدید کے بعد نئی تبدیلیاں ہوئیں۔ یہ تبدیلیاں ہمہ گیر تھیں لیکن نیا حیدرآباد انہی تبدیلیوں

www.taemeernews.com

سے بنتا ہے - اس وقت تک ملک کا معیارِ تعلیم بہت کافی بڑھ چکا ہے اور اردو ادب میں کئی تحریکیں ابھریں بھی اور ختم بھی ہو گئیں۔ مختلف مکتبِ خیال کے ادیبوں اور محققین کی ایک بڑی تعداد موجودہ ماحول کو مرتب کرتی ہے۔ اس کے جائزہ کے لئے ایک سفینہ چاہیئے۔ ویسے بھی معاصر عہد کی تاریخ پر تبصرہ کرنے میں جو ضمنی بحثیں اٹھ کھڑی ہوتی ہیں ان کے احاطہ کی اس وقت گنجائش نہیں ہے۔ تاہم جن حضرات نے غالب پر کوئی قابل لحاظ کام کیا ہے ان کا تذکرہ متعلقہ ابواب میں آ ہی جائے گا۔

پس از غالب یہ ایک صدی حیدرآباد میں غالب فہمی کے لئے بہت سازگار رہی ہے اور امعانِ نظر کے ساتھ غالب کا مطالعہ، نیز وسیع پیمانہ پر غالبیات کی تدریس کا کام اس ایک صدی میں ہوتا رہا۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ جدید سائنٹیفک طریقہ ہائے تحقیق کے مطابق غالبیات کے آغاز کا سہرا حیدرآباد ہی کے سر جاتا ہے۔

●●

www.taemeernews.com

تعلّقات

تماشائے اہلِ کرم

(۱)

مرزا غالب صرف اس مفہوم میں شاعر نہیں تھے کہ انہوں نے اُردو اور فارسی میں ہمارے لئے ایک گرانقدر ادبی ورثہ چھوڑا ہے، بلکہ شاعر ہونا ان کے لئے ایک طرز زندگی تھا۔ ان کے تصور کے مطابق سوسائٹی میں شاعر کا منصب بلند درجہ پر تھا۔ ان کے پیش نظر وہ مثالیں تھیں جہاں قرون وسطیٰ کے "چہرہ نظم حکومت" میں شاعر ایک "دیدۂ بینا" کا مقام رکھتا تھا اور حکومتیں شاعروں کی ضروریات اور آسائش کا ہر طرح خیال رکھتی تھیں ۔ بالخصوص وہ شعرا جو فنِ شعر میں بلند مقام رکھتے تھے انہیں قرب سلطانی نصیب ہوتا تھا اور ملک الشعرا بنایا جاتا تھا۔ چنانچہ غالب حکومت برطانیہ کو اپنے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

"جیسا کہ روم و ایران کے بادشاہ اور دیگر ملکوں کے حکمران شاعروں اور ستائش گروں کو بخشش و بخشائش کے رنگا رنگ طریقوں سے

لہ کلیات نثر صفحہ ۳۹۴ مطبوعہ نول کشور ۱۸۷۱ء

www.taemeernews.com

نوازتے، اُن کے منہ موتیوں سے بھر دیتے، اُن کو سونے میں تلواتے
دیہات عطا کرتے اور خزانے لٹاتے، یہ سخن گستر اور ستائش گر
بھی زبان شہنشاہ سے مہر خوانی و فرمان اور خوانِ شہنشاہ سے
ریزۂ نان چاہتا ہے۔"

غالب اپنے عہد کے عظیم ترین شاعر تھے اور انھیں اپنی عظمتوں کا احساس بھی تھا۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ اربابِ اقتدار ان کی قدر اور پذیرائی اُسی طرح کریں جس کے وہ مستحق تھے۔ خواجہ حافظ کا یہ شعر ان کی پوری زندگی پر صادق آتا ہے۔

دوستان عیبِ منِ بے دل حیران مکنید　　گوہرے دارم و صاحب نظرے می جویم

مرزا اپنا یہی گوہر لئے ہوئے زندگی بھر کسی صاحب نظر کے جویاں رہے۔ اور اسی جستجو میں فقیروں کا بھیس بنا کر انہوں نے دل کھول کر اہل کرم کا تماشا دیکھا۔ مرزا کو ایسے اہل کرم کی آرزو رہی جو صاحبِ نظر بھی ہو۔

(۲)

مرزا کی عمر کے ابتدائی تیئس، چوبیس سال خوشحالی اور بے فکری میں گذرے لیکن ۱۸۲۲ء میں نواب احمد بخش خاں نے جب یہ فیصلہ کیا کہ ان کے بعد گدی پر اُن کے بڑے بیٹے نواب شمس الدین خاں بیٹھیں گے اور وہ خود ریاست کے انتظام سے دست بردار ہو کر گوشہ نشین ہو گئے تو اس نئے انتظام کا غالب کے معاملات پر بہت

www.taemeernews.com

گہرا اثر پڑا۔[1] اور یہیں سے غالب کی مالی پریشانیوں کا آغاز ہوا۔ اس واقعہ کے بعد قرض خواہوں کے تقاضے، چھوٹے بھائی مرزا یوسف کی دیوانگی، مرزا کے خسر الٰہی بخش خاں کا انتقال (۱۸۲۶ء) اور نواب احمد بخش خاں سے حق طلبی میں ناکامی ایسے واقعات تھے جن سے مرزا گھبرا اٹھے، اس کے بعد مرزا کو اپنے مسائل حل کرنے کے سلسلہ میں کئی سفر کرنا پڑے۔ جن میں کلکتہ اور لکھنؤ کے سفر قابل ذکر ہیں جن کی وجہ سے مرزا کی شخصیت نئے تجربوں سے دوچار ہوئی اس سفر میں مرزا کو کم و بیش ۵ مہینے لکھنؤ میں ٹھہرنا پڑا۔ اور کلکتہ میں ڈیڑھ سال تک مرزا کا قیام رہا۔ اس سفر سے مرزا کے مالی حالات تو کچھ ٹھیک نہیں ہوئے بلکہ کلکتہ میں انھیں ایک ادبی معرکہ پیش آیا جس سے وہ مزید ناگواریوں سے دوچار ہوئے۔

اسی زمانے میں مرزا نصیر الدین حیدر کو جو قصیدہ پیش کیا' اس سے مرزا کی ان پریشانیوں ' اضطراب اور اضطرار کا اندازہ کیا جا سکتا ہے جن سے وہ دہلی چھوڑتے وقت دوچار تھے۔ یہاں اس کے چند شعر پیش کئے جاتے ہیں:

---

[1] مالک رام ذکر غالب (۱۹۶۴ء) صفحہ ۵۴، ۵۵

www.taemeernews.com

پائے پُر آبلہ ذوقِ سفرا فسرد مرا | راہ بیداسے بلا از پئِ دنداں رفتم
حالِ من بنگر واز عاقبت کار مپرس | عمر خود گشتم و درغصہ بپایاں رفتم
تا بنا شد دلمے ترک وطن نتواں کرد | مشکلے در نظر آوردم و آساں رفتم
چہرہ اندودہ بہ گرد دفترہ آغشتہ بخوں | خود گواہم کہ ز دہلی بہ چہ عنواں رفتم
اضطرار آئینہ پرداز جلائے وطن است | نہ بہ دل رفتم از آں بقعہ بل از جاں رفتم
ہم جگر تفتہ ز کیں خواہی اغیار شدم | ہم دل آزردہ ز بے مہری خویشاں رفتم

گوش تا بی دہم اندیشہ خود راکہ عبث
جادہ رفتم و رفتم چہ پریشاں رفتم[1]

مرزا سفر سے جب دہلی واپس آئے تو اس وقت تک قرض بہت بڑھ چکا تھا اور بقول شیخ محمد اکرام "چونکہ قرض خواہوں کو کوئی بڑی جائیداد نظر نہیں آتی تھی۔ وہ قرضہ کی وصولی کے لئے بے تاب ہو رہے تھے، چنانچہ ان میں سے دو نے دیوانی عدالت میں مرزا کے خلاف دعویٰ کر کے ڈگری حاصل کر لی، مرزا کے لئے یہ زمانہ سخت مصیبت کا تھا۔ ان میں زرِ ڈگری ادا کرنے کی طاقت نہ تھی اور قاعدے کے مطابق انہیں جیل جانا تھا، لیکن چونکہ بقول اُن کے مشہور اشخاص کے ساتھ

---

[1] کلیات نظم فارسی قصیدہ ۴۹ مطبوعہ نولکشور ۱۸۶۳ء

www.taemeernews.com

اتنی رعایت ہوتی تھی کہ عدالت کا چپراسی اُن کے گھر نہ جاتا اور جب تک مدیوں[1] رستے میں نہ ملے اسے قید نہ کرتے، مرزا بھی گھر بیٹھ رہے۔[2] مرزا ابھی اس "قید خانہ نشینی" میں تھے کہ ۲۲ر مارچ ۱۸۳۵ء مرزا کے ایک مُربّی ولیم فریزر ریزیڈنٹ دہلی کو کسی نے گولی سے ہلاک کر دیا اس واقعہ کا مرزا پر بڑا سخت اثر ہوا اور وہ اپنے آپ کو بہت بے سہارا محسوس کرنے لگے۔

(۳)

یہاں یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ مرزا غالب کے شیخ امام بخش ناسخ سے دوستانہ تعلقات تھے۔ یہ تعلقات اتنے گہرے تھے کہ مرزا غالب اپنے نجی معاملات بھی انہیں لکھا کرتے تھے۔ چنانچہ ناسخ اور غالب کی خط و کتابت ہمارے لئے خاص طور پر دلچسپی کی حامل ہے کیونکہ انہی خطوط سے اس بات پر روشنی پڑتی ہے کہ مرزا غالب کو ابتدائی عمر میں حیدرآباد آنے اور یہاں سے فیض پانے کی رغبت نہیں تھی جس کی کئی وجوہات ہیں۔ پہلے مرزا کا وہ خط ملاحظہ فرمائیے جو انہوں نے ولیم فریزر کی موت کے بعد ناسخ کو لکھا تھا۔

حضرت سلامت

قدسی صحیفہ مشام جاں کے لئے بوے یکدلی و ہمدردی لے کر

---

[1] Debter

[2] شیخ محمد اکرام، حیاتِ غالب

www.taemeernews.com

آیا۔ چار مہینے ہو گئے کہ یہ عریضہ نگار ایک کنج میں بیٹھا ہے۔ اپنوں اور پرایوں پر آمد و رفت کا راستہ بند کر رکھا ہے۔ اگرچہ میں زنداں میں نہیں ہوں لیکن میری خورش و خواب زندانیوں کی مانند ہے۔ ان چند دنوں میں جو رنج و آشوب میں نے دیکھا ہے، میں کافر ہوں گا، اگر کسی کافر نے صد سالہ عذابِ جہنم میں اس کا آدھا بھی دیکھا ہو۔ چنانچہ عرفی کہتا ہے۔

از بوے تلخ سوخت دماغِ امید و یاس
زہرے کہ دریالۂ ما کرد روزگار

میرے خرمن میں صبر و ثبات میں جو پہلا شرارہ ڈالا گیا وہ یہ تھا کہ قرضداروں کے گروہ سے دو افراد نے، جیسا کہ عدالت انگریزی کا قاعدہ ہے، میرے حق میں عدالت سے ڈگری حاصل کر لی۔ انجام اس کا یہ ہے کہ یا تو ڈگری کی رقم ادا کر دی جائے یا خود کو گرفتاری کے لئے پیش کر دیا جائے۔ اس معاملہ میں شاہ و گدا سب برابر ہیں۔ ہاں، مشہور لوگوں کے لئے اتنا ہے کہ عدالت کا پیادہ ان کے گھر پر نہیں جا سکتا۔ جب تک (مدیون) راستہ میں نہ ملے

www.taemeernews.com

گرفتار نہیں کیا جا سکتا۔ مجبوراً اپنی آبرو کے خیال سے ہٹ
کر بیٹھ رہا اور باہر نکلنا چھوڑ دیا۔ آج تک یہی بند خودداری
پاؤں میں باندھے اور ڈوبا ہوا دل لیے ہوئے پڑا ہوں
اس گوشہ نشینی اور افسردہ دلی کے زمانہ میں ایک ناخدا ترس
ظالم نے خدا اس کو ہمیشہ عذاب میں مبتلا رکھے، دلیم فریزر
صاحب بہادر کو جو دہلی کے ریزیڈنٹ اور غالب کے مربّی
تھے ایک اندھیری رات میں طپنچہ سے مار ڈالا اور میرے
لئے باپ کی موت کا غم تازہ کر دیا۔ دل اپنی جگہ سے ہٹ
گیا اور اس اندوہ عظیم نے دماغ کو ماؤف کر دیا، سکون غارت
کر ڈالا اور دل سے امید کا نقش مٹا دیا۔[1] .....

چونکہ یہ خط ولیم فریزر کی موت کے فوری بعد لکھا گیا ہے لہٰذا یہ
۱۸۳۵ء کا ہی ہوگا۔ اس خط کا جواب جو ناسخ نے دیا وہ تو دستیاب
نہیں ہو سکا لیکن اس کے مضمون سے معلوم ہوتا ہے کہ ناسخ
نے مرزا سے ایک تو یہ دریافت کیا کہ زرد گری کتنا ہے دوسرے
انہیں یہ مشورہ دیا کہ وہ حیدرآباد جائیں۔ اور غالباً اس سلسلہ میں

---

[1] کلیات نثر فارسی ص ۱۶۱ مطبوعہ نولکشور ۱۸۷۱ء

www.taemeernews.com

یہ بھی لکھا کہ اگر وہ حیدرآباد جائیں تو وہاں چندولال ان کی قدر کرینگے۔ انہیں نہ تو ناسخ کا یہ پوچھنا پسند آیا کہ زرڈگری کتنا تھا اور نہ ہی حیدرآباد جانے کا مشورہ۔ مرزا اس مشورہ پر الٹا چراغ پا ہوگئے۔ یہاں مرزا کے اس خط کا ترجمہ درج کیا جاتا ہے۔

سبحان اللہ!

اس ساری ناروائی کے باوجود میری متاع کا خریدار اور اس ساری ناکسی کے باوجود مجھے ایک غمخوار نصیب ہے۔ جب تک عنایات کا شکریہ نہ ادا کروں کیا کروں۔ بے شک اسی فکر میں خود بخود زبان پر آتا ہے کہ "جاں فدائش باد!" غیرت چشمک زنی اور ہمت جاں گدازی میں ہے۔ جان کیا چیز ہے، اگر پائے دوستی پر نثار کردوں کیونکہ یہ (جان) تو جواں مرد دشمن کو بھی دینے میں دریغ نہیں کرتے۔ ظاہر ہے کہ کس قدر حق وفا خدمت میں پہنچا سکتا ہوں۔

قبلہ و قبلہ گاہِ غالبِ دردمند! سلامت

صحیفۂ مشکیں رقم نے مشام آرزو کو غالیہ سا اور چہرۂ آبرو کو پردہ کشا کیا۔ مخدوم کے قلم نے چند پردوں میں اظہار التفات فرمایا ہے اور پرسشِ روداد کے دوران میں دو مقامات پر

www.taemeernews.com

ہمدمی کا شرف بخشا۔ اوّل زرِ ڈگری کی مقدار کی بابت استفسار اور پھر سفرِ دکن کی رہنمائی۔

مخفی مبادر جو کچھ اس سے پہلے بندگی نامہ میں ادھر کا حال بیان کیا گیا ہے وہ دل کی بھڑاس نکالنے کیلئے تھا۔ ورنہ مجھے کہ تقاضوں کی کشاکش کا عادی ہو چکا ہوں اور قرض کے مخمصوں میں مدتِ دراز بسر کی ہے، اس ہنگامہ سے کوئی افسردگی یا نقصان نہیں ہے۔ نیز خود یہ رقم جو دارالقضا مجھ سے طلب کر رہا ہے اتنی نہیں ہے کہ مجھے پریشان کر سکے۔ ہے کتنی؟ پانچ ہزار سے زیادہ نہیں ہے۔ زیوروں کی قیمت اور شبستان کا پیرایہ اس کی پابجائی کر سکتا ہے۔ مجھے جو کچھ چاہیے وہ چالیس ہزار سے زیادہ اور پچاس ہزار سے کم ہے۔ حاشا! اس کی وجہ سے امرار کی آرزو گردِ دل بن جائے یا یہ بات خود میرے مناسب حال ہوتی۔ مگر اسقدر ہمدست ہو جائے کہ بیٹھ جاؤں اور مٹھی مٹھی مدعیوں کی طرف پھینکتا رہوں اور خود کو، اس بلا سے کہ جس کو دنیا کہتے ہیں، ایک طرف کو کھینچ کر قلندر بن جاؤں اور گیتی کے اس سرے سے اس سرے تک پھروں۔

www.taemeernews.com

یہ کہ میں نے اپنی عمر کا ایک حصہ ضائع کیا اور شاہ اودھ کی مدح سرائی کی وہ اسی تمنا کی بساط آرائی اور اسی ہوس کی گدائی تھی۔ چونکہ کام بنا نہیں میرا زمزمہ بادشاہوں کے دل سخت میں اترا نہیں۔ میں نے منہہ پھیر لیا اور خود پر افسوس کیا۔

اب میں کہاں اور سفر دکن کہاں تیس سال رنگ و بو اور مئے و نئے میں بسر ہو گئے۔ اب دل میں ان چیزوں کی رغبت باقی نہیں رہی اور بندِ تن سے رہائی کی خواہش ظاہر ہو رہی ہے۔ جو کچھ میں چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ ایک دفعہ ایران جاؤں، شیراز کے آتش کدے دیکھوں اور اگر عمر نے وفا کی تو آخر کار نجفِ اشرف پہنچوں اور اس کا مزار دیکھوں کہ جس نے کیشِ آبا سے باہر نکالا اور بے خود کر کے اپنی طرف کھینچ لیا، مستانہ جان دیدوں اور بالین فنا پر سر رکھدوں۔

غالب روشِ مردمِ آزاد جدا است
رفتار اسیرانِ رہ و زاد جدا ست
ما ترکِ مراد را ارم می دانیم
واں باغچہ ضبطیٔ شداد جدا است

www.taemeernews.com

انصاف بالائے طاعت ہے۔ سفر دکن کا ارادہ قرض کے
بند توڑے بغیر ممکن نہیں اور جب یہ بند ٹوٹ جائے اور یہ
پتھر راستہ سے ہٹ جائے تو بڑے افسوس کی بات ہوگی
اگر نجف کے سوا کسی اور طرف رخ کروں اور مجھ پر وائے
اگر اس کے سوا کسی اور کی تلاش میں رہوں۔

چندولال میرے زمزمہ کو کیا جانے اور میری روش کو
کیا پہچانے۔ وہ جو فارسی میں قتیل کو استاد سمجھتا ہو اُسے
غالب سے کیا کام، اور اُردو میں نصیر کی تعریف کرتا ہو
ناسخ سے کیا کام۔ خود اس کی عمر اسّی سے متجاوز ہے
جب تک میں اس تک پہنچوں وہ عدم آباد پہنچ چکا ہوگا۔"[1]

ناسخ نے مرزا کو جو مشورہ حیدرآباد جانے کا دیا تھا وہ نیک نیتی اور حیدرآباد کے تعلق سے ان کے ذاتی تجربہ پر مبنی تھا، مولانا محمد حسین آزاد کے حسب ذیل بیان سے اس مشورہ کے پس منظر پر روشنی پڑتی ہے۔

"(ناسخ نے) کسی کی نوکری نہیں کی۔ سرمایہ خداداد۔ اور جوہر

---

[1] متفرقات غالب ص ۹۹

www.taemeernews.com

شناسوں کی قدردانی سے نہایت خوشحالی کے ساتھ زندگی بسر کی۔ پہلی دفعہ الہ آباد میں آئے ہوئے تھے جو چندو لال نے بارہ ہزار روپے بھیج کر بلا بھیجا، انھوں نے لکھا کہ اب میں نے سید کا دامن پکڑا ہے، اسے چھوڑ نہیں سکتا۔ یہاں سے جاؤں گا تو لکھنؤ ہی جاؤں گا۔ راجہ موصوف نے پھر خط لکھا، بلکہ پندرہ ہزار روپے بھیج کر بڑے اصرار سے کہا کہ یہاں تشریف لائیے گا تو ملک الشعراء خطاب دلاؤں گا۔ حاضری دربار کی قید نہ ہوگی۔ ملاقات آپ کی خوشی پر رہے گی پر انھوں نے منظور نہ کیا......"[1]

اس بیان سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ناسخ نے مرزا کو ان سارے انعامات اور اعزازات کے پیش نظر حیدر آباد جانے کا مشورہ دیا جن سے بہ وجوہ وہ خود استفادہ نہیں کر سکے۔ یہ بات بظاہر ایک معمّا سی معلوم ہوتی ہے کہ ایک طرف تو مرزا ڈگریوں کے خوف سے خانہ نشین ہو گئے ہیں اور دوسری طرف حیدر آباد جانے کا مشورہ دیا جاتا ہے تو انہیں اپنی مصیبتیں بھی سہل معلوم ہونے

---

[1] آب حیات صفحہ ۳۵۱ مطبوعہ مبارک علی لاہور

www.taemeernews.com

لگتی ہیں۔ یہ غالب کی جوانی کا زمانہ ہے، کچھ ہی عرصہ قبل اپنے مالی مسائل کے حل کے لئے انہوں نے کلکتہ کا طویل اور کٹھن سفر کیا تھا۔ حیدرآباد جانا ان کے لئے زیادہ مشکل نہیں تھا۔ اسکے باوجود انہوں نے ناسخ کو جو جواب دیا ہے وہ محل نظر ہے اور اسکی وجوہ چند در چند ہیں۔ (۴)

سب سے پہلی وجہ یہ ہے کہ اس وقت تک حیدرآباد سے جو مرزا کی یادیں وابستہ تھیں وہ خوشگوار نہیں تھیں۔

مرزا نے آنکھ کھولتے ہی یہ سنا کہ ان کے والد نواب میر نظام علی خاں آصف جاہِ ثانی کی افواج میں ملازم تھے اور اچھے خاصے مرتبہ پر فائز تھے لیکن ایک خانہ جنگی کے بکھیڑے میں "گھبرا کر" انھوں نے وہ نوکری چھوڑ دی۔ چنانچہ غالب اپنے حیدرآبادی شاگرد حبیب اللہ ذکا کو لکھتے ہیں۔

"باپ میرا عبداللہ بیگ خاں بہادر لکھنو جا کر نواب آصف الدولہ کا نوکر رہا بعد چند روز حیدرآباد جا کر نواب نظام علی خاں کا نوکر، تین چار سو سوار کی جمعیت سے ملازم رہا، کئی برس وہاں رہا وہ نوکری ایک خانہ جنگی کے بکھیڑے میں جاتی رہی والد نے گھبرا کر الور کا قصد کیا

www.taemeernews.com

راؤ راجہ بختاور سنگھ کا نوکر ہوا اور وہاں کسی لڑائی میں مارا گیا۔"[1]

یہ غالب کی پریشانیوں کا پہلا پہلا دور تھا۔ ان حالات میں حیدرآباد کے ذکر نے اگر اُن کے محرومیوں کے احساس کو بڑھا دیا ہو تو کچھ تعجب نہیں۔ یہی نہیں کہ مرزا غالب کے والد سالہا سال تک ایک اچھی خدمت پر مامور رہنے کے بعد اس کو چھوڑنے پر مجبور ہو گئے اور اسکے بعد کی ملازمت نے غالب کو یتیم بنا دیا بلکہ بھائی کا واقعہ اس سے زیادہ رنج دہ تھا۔

مرزا غالب کے بھائی مرزا یوسف عمر میں ان سے دو برس چھوٹے تھے، غالب اپنے بھائی کو بیحد عزیز رکھتے تھے، اور کیوں عزیز نہ رکھتے۔ مرزا کا اپنا خاندان ایک بھائی اور ایک بہن پر مشتمل تھا۔ اُن کو میرزا یوسف سے جو محبت تھی اس کا اندازہ غالب کے متعدد اشعار اور تحریروں سے کیا جا سکتا ہے۔ ایک شعر جو میرزا یوسف کے غسل صحت پر میرزا نے اپنی ایک معرکتہ الآرا غزل کے مقطع کے طور پر کیا ہے یہاں پیش کیا جاتا ہے

دی مرے بھائی کو حق نے از سر نو زندگی
میرزا یوسف ہے غالب یوسف ثانی مجھے

---

[1] اردوے معلی ص ۲۸ مطبع نامی مجتبائی دہلی مطبوعہ ۱۸۹۹ء

www.taemeernews.com

میرزا یوسف کی شادی مرزا غالب کی سرپرستی میں ہوئی اور اس شادی کا رقعہ جو مرزا کی طرف سے جاری ہوا تھا وہ ان کے جذبۂ مسرت وشادمانی کا آئینہ دار ہے۔

مرزا نے جیسا اپنے بارے میں خود کہا ہے سو پشت سے ان کا پیشۂ آبا سپہگری تھا غالب اسے چھوڑ کر شعر وادب کے میدان میں آگئے تھے اور میرزا یوسف کو اسی پیشۂ آبا میں لگایا چنانچہ مرزا یوسف راجہ چندولال کے زمانے میں نواب میر سکندر جاہ آصف جاہ ثالث کے "افواج قاہرہ" میں نہایت معتدد عہدے پر سرفراز تھے[1] مالک رام صاحب کا خیال ہے کہ چونکہ ان سے پہلے ان کے والد میرزا عبداللہ بیگ خاں بھی آصف جاہ ثانی میر نظام علی خان کے زمانے میں حیدرآباد کی فوج میں ملازم رہے تھے قرین قیاس ہے کہ یہ پرانے تعلقات ملازمت حاصل کرنے میں میرزا یوسف کے کام آئے ہوں گے۔[2]

دیکھنا یہ ہے کہ مرزا یوسف حیدرآباد میں کب تک ملازم رہے

---

[1] کارنامہ سروری ص۱۹ مطبوعہ مسلم یونیورسٹی علیگڈھ ۱۹۳۲ء

[2] نوائے ادب بمبئی اپریل ۱۹۵۹ء

www.taemeernews.com

اور کن حالات میں انہوں نے یہاں کی نوکری چھوڑی تھی۔ اس بات کی شہادتیں موجود ہیں کہ میرزا یوسف ۱۸۱۲ یا ۱۸۱۳ میں دہلی منتقل ہوئے اور جب تک ان کی شادی نہیں ہوئی تھی وہ میرزا غالب کے ساتھ ہی رہتے تھے اور پھر اس بات کی شہادتیں ملتی ہیں کہ وہ ۱۸۲۷ یا ۱۸۲۸ء میں دہلی میں موجود تھے۔ لہذا میرزا یوسف حیدرآباد میں قیاساً ۱۸۱۴ء سے ۱۸۲۷ کے درمیان کسی زمانے میں رہے ہیں۔

میرزا یوسف کے قیام حیدرآباد کے مزید تعین سے پہلے اس امر کا جائزہ مناسب ہوگا کہ انہوں نے کن حالات میں حیدرآباد دکن چھوڑا۔ سرور جنگ کا پورا بیان یہ ہے۔

"دادا صاحب مرحوم مرزا اکبر بیگ سیاح آدمی تھے۔ عربی فارسی میں فرد فرید تھے اور علوم ریاضیات، ہیئت و ہندسہ وغیرہ کے علاوہ فن نجوم و رمل میں ید طولیٰ رکھتے تھے اور ان علوم کی تکمیل کی غرض سے دور دراز ممالک میں سیر و سفر کیا۔ حتیٰ کہ اس زمانے میں حج بیت اللہ کی نعمت حاصل کرتے ہوئے ملک اطالیہ پہونچے اور وہاں علمی ریاضیات حاصل کی۔ وہاں سے مغرب اقصیٰ کی سیر کرتے ہوئے حیدرآباد دکن واپس آئے اور مہاراج چندو لال کے ہاں مہمان رہے۔ اس

www.taemeernews.com

ہی زمانے میں مرزا یوسف برادر حقیقی کلاں مرزا اسد اللہ
خاں غالب افواج قاہرۂ دولت آصفیہ میں نہایت مقتدر
عہدہ پر سرفراز تھے۔ کسی دشمن نے ایسا جادو کیا یا ایسی دوا
کھلا دی کہ وہ مجنون محض ہو گئے اور تا وقت انتقال مجنون رہے۔"[1]

تعجب ہے کہ سرور جنگ جو خود یوسف مرزا کے قریبی عزیز تھے،
ان کے دادا میرزا غالب کی حقیقی بہن کے شوہر اور ان کی ساس عزیز النساء
بیگم خود میرزا یوسف کی بیٹی اور میرزا غالب کی حقیقی بھتیجی تھیں۔ انہوں
نے اس بیان میں میرزا یوسف کو غالب کا برادر کلاں لکھا ہے! حالانکہ
یہ امر مزید کسی تصدیق کا محتاج نہیں ہے کہ میرزا یوسف مرزا غالب
سے دو سال چھوٹے تھے۔

سرور جنگ کے بیان سے ظاہر ہے کہ میرزا یوسف حیدرآباد ہی
میں مجنون ہو گئے تھے لہذا یہ امر قرین قیاس ہے کہ میرزا یوسف کی
شادی ان کے زمانہ ہوش مندی میں حیدرآباد آنے سے پہلے ہی ہو چکی
تھی۔ میرزا یوسف کی شادی کب ہوئی اس کی ٹھیک تاریخ نہیں
ملتی۔ خود اُن کی شادی کے رقعہ میں تاریخ صرف ۲۲ شعبان دی گئی ہے

---

[1] کارنامہ سروری ص ۱۹

www.taemeernews.com

اور سنہ کا اندراج نہیں ہے۔ مالک رام کے خیال کے مطابق چونکہ شادی دہلی میں ہوئی تھی لہٰذا مرزا غالب کے مستقل طور پر دہلی آجانے کے بعد ہوئی ہوگی یعنی ۱۸۱۲-۱۸۱۳ء کے بعد[1]۔۔۔ میرزا یوسف کی شادی خود میرزا غالب کی سرپرستی میں ہوئی تھی۔ اور اس کا امکان ہے کہ میرزا نے اس شادی کا اہتمام اپنی مالی پریشانیوں کے آغاز سے پہلے ہی کر دیا ہوگا۔ گویا ۱۸۲۲ء سے پہلے۔ ان سب واقعات کے پیش نظر گمان غالب یہ ہے کہ میرزا یوسف ۱۸۱۸ء سے ۱۸۲۶ء کے درمیان حیدرآباد میں رہے ہیں۔

بہرحال مرزا یوسف جس عالم میں حیدرآباد سے واپس ہوئے ہیں وہ مرزا غالب کیلئے ایک اندوہناک سانحہ تھا۔ میرزا یوسف خود مرزا غالب کے بیان کے مطابق تیس سال کی عمر میں دیوانہ ہوئے اور تیس سال دیوانگی کے عالم میں جیے جسوقت مرزا یوسف کی عمر ۶۰ سال تھی مرزا غالب ان کی بابت یوں لکھتے ہیں:

"بھائی کہ عمر میں مجھ سے دو سال چھوٹا ہے اس نے تیس سال کی عمر میں عقل کھودی دیوانہ اور پاگل ہوگیا۔ تیس سال ہوگئے ہیں کہ یہ دیوانہ کم آزار بے خروش، مست و بے ہوش

---

[1] مالک رام، میرزا یوسف، نوائے ادب (بمبئی) اپریل ۱۹۵۹ء

www.taemeernews.com

زندگی گذارتا ہے[1]

میرزا یوسف کے انتقال پر میرزا غالب نے کئی قطعات کہے ہیں جن کے منتخب اشعار یہاں پیش کیے جاتے ہیں۔

دریغ آن کہ اندر درنگِ سہ بیست
سہ دہ شاد و سی سال ناشاد زیست
تہِ خاک بالین زخشتش نہ بود
بجز خاک در سرنوشتش نہ بود
خدایا بریں مردہ بخشایشے
کہ نادیدہ در زیست آسایشے
سر دشتے بہ دلجوئی او فرست
روانش بہ جاویدِ مینو فرست

میرزا نے اپنے بھائی کے مرنے کی تاریخ کہی تھی

زسالِ مرگِ ستمدیدہ میرزا یوسف
کہ زیستے بجہاں درخویش بیگانہ
یکے در انجمن از من ہمی پژوہش کرد
کشیدم "آہے وگفتم" دریغ دیوانہ"

۱۲۹۰ - ۱۶ = ۱۲۷۴

[1] کلیات نثر فارسی صفحہ ۳۹۳ مطبوعہ نولکشور ۱۸۷۱ء
ایضاً صفحہ ۳۹۹

www.taemeernews.com

بھائی کے عالم ہوش اور عالم دیوانگی کے اوصاف، میرزا یوں بیان کرتے ہیں:

"یہ خوش سرشت اور نیک سرنوشت ساٹھ سال خوش و ناخوش جیا اور اس کے منجملہ تیس سال ہوش مند اور تیس سال بے ہوش جیا، ہوش مندی میں غصہ پی جاتا اور بے ہوشی میں آزار نہ پہنچاتا اس کا آئین تھا۔[1]

ان باتوں سے مرزا کی برادرانہ محبت اور بھائی کی دیوانگی کے غم کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، یہ احساسات تو بھائی کی دیوانگی پر تیس سال گذر جانے کے بعد کے ہیں، لیکن اس حادثہ کی ابتدا میں یہ رنج جسقدر قوی ہوگا اس کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ جب اس رنج کا تعلق حیدرآباد سے ہے تو حیدرآباد کے ذکر پر مرزا کی وہ ناخوشگواری جو ان کے مکتوبات بنام ناسخ میں پائی جاتی ہے وہ فطری ہے۔

۵

باپ اور بھائی کے صدمے سے قطع نظر مرزا غالب نے ناسخ کو جو وجوہ لکھی ہیں وہ بھی بڑی حقیقی ہیں، شاہ نصیر اور قتیل کو مرزا غالب

---

[1] کلیات نثر فارسی ص ۳۹۹ مطبوعہ نولکشور ۱۸۷۱ء

www.taemeernews.com

نظر میں نہیں لاتے تھے، قتیل سے تو انہیں سخت نفرت تھی۔ اور خصوصاً اس زمانے میں کیونکہ قیام کلکتہ کے زمانے میں غالب کے کلام پر وہاں کی محفلوں میں جو اعتراض ہوئے تھے وہ یا تو قتیل کے شاگردوں کی جانب سے ہوئے تھے یا قتیل کے معیار سخن کی روشنی میں۔ میرزا غالب بقول مالک رام:

"بھلا قتیل اور دوسرے ہندوستانی فارسی دانوں کو کب خاطر میں لاتے تھے، انہوں نے قتیل کا نام سن کر (دوران قیام کلکتہ) ناک بھوں چڑھائی اور کہا، قتیل کون؟ دہی فریدآباد کا کھتری بچہ؟ میں کیوں اس فرد مایہ کو سند ماننے لگا۔"[1]

ہندوستانی فارسی دانوں سے تو مرزا کو نفرت تھی ہی لیکن ابتدائے عمر میں سفر کلکتہ اور انتہائے عمر میں برہان قاطع کے جھگڑوں کے نتیجہ میں قتیل میرزا کی شدید نفرت و حقارت کا مورد ہو گیا تھا۔ غالب کو اس کی اطلاع تھی کہ مہاراجہ چندولال شاہ نصیر کو اردو میں اور فارسی میں قتیل کو استاد مانتے تھے چنانچہ یہ تصور ان کے لئے حد درجہ اذیت ناک تھا کہ وہ نصیر یا قتیل کے کسی عقیدت مند کے پاس غرض مند بن کر

---

[1] ذکر غالب صـ۴۷ـ چوتھا ایڈیشن

www.taemeernews.com

جائیں اور اگر جاتے بھی تو شکست کے تجربے کی روشنی میں وہ یہ خوب جانتے تھے کہ اس کے نتائج کس قدر ہنگامہ خیز ہوں گے۔ مرزا کی نظر ہمیشہ مستقبل پر رہی اور مستقبل سے ان کی امیدیں ہمیشہ وابستہ رہیں سینتیس برس کی عمر میں ان کے لیے مستقبل کا ایک وسیع عرصہ باقی تھا اور کوئی وجہ نہیں تھی کہ وہ اپنے معیارات سے اتر جاتے۔

اس کے علاوہ مرزا کے کئی رشتہ دار حیدرآباد میں تھے، ان کے ذریعہ یہاں کے حالات انہیں معلوم ہوتے رہتے ہوں گے۔ خود میرزا کے بہنوئی میرزا اکبر بیگ جب حیدرآباد سے دہلی پہونچے ہونگے تو انھوں نے دربار چندولال اور حیدرآباد کے احوال مرزا غالب سے بیان کئے ہوں گے جنکی روشنی میں مرزا نے یہاں کے حالات اور سیاست کا ٹھیک اندازہ کیا اور مناسب فیصلہ کیا۔ وہ دربار معلیٰ سے وابستگی کے خواہاں تھے اگر یہ ممکن نہ تھا تو کسی والئ ریاست کی طرف دیکھتے نہ کہ وہاں کے ملازموں کی طرف، میرزا عہد مغلیہ کی اصطلاح میں خاندانی تھے اور خود ملازمت کو اپنے لئے باعث ننگ سمجھتے تھے کجا یہ کہ وہ کسی والئ ریاست کے ملازم کے حلقہ بگوش ہو جاتے اس وقت دکن میں والئ ریاست نواب سکندر جاہ آصفجاہ ثالث اور ان کے وزیر اعظم کی جو حیثیت رہ گئی تھی اس کا تذکرہ ہم

www.taemeernews.com

ابتدا میں کر چکے ہیں لہٰذا اس کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ راجہ چندولال سے صرفِ نظر کر کے میرزا راست طور پر آصف جاہ ثالث کو مخاطب کرتے۔

(۶)

میرزا کی مشکلیں بڑھتی گئیں عسرت و تنگدستی سے لیکر گرفتاری اور اسیری تک سب کچھ اُن پر گذر گیا تب کہیں جا کر کچھ آسانیوں کی صورت دکھائی دی۔ اب میرزا کے دوستوں کو بھی اس کی فکر ہوئی کہ ان کے مالی مسائل کا حل نکالیں چنانچہ یہ طے پایا کہ کسی طرح مرزا دربارِ معلّٰی سے وابستہ ہو جائیں۔ دربارِ معلّٰی میں ذوقؔ استاد ظفرؔ تھے اور بقول مالک رام:

"اُن کی (ذوق) کی موجودگی میں کوئی اور استاد شاہ اور ملک الشعراء تو ہو نہیں سکتا تھا اور غالب اس سے کم پر قناعت نہیں کر سکتے تھے .... مگر برا ہو احتیاج کا، جب سب طرف سے مایوس ہو گئے تو آخر انہوں نے بادشاہ کی "وظیفہ خواری" اور پھر "دعا گوئی" پر آمادگی کا اظہار کیا۔ مولانا فخر الدینؒ کے پوتے مولانا نصیر الدین عرف میاں کالے، بہادر شاہ ظفرؔ کے پیر تھے اور غالب کے بھی دلی دوست اور پرانے مہربان۔ ان کے علاوہ احترام الدولہ حکیم احسن اللہ خاں مدار المہام بھی ان کے خاص قدرداں تھے ان صاحبوں نے سفارش کی اور

www.taemeernews.com

> بہادر شاہ نے منظور کر لیا کہ میرزا خاندانِ تیموری کی تاریخ فارسی زبان میں لکھیں۔ میرزا جمعرات کے دن چار جولائی ۱۸۵۰ء (تئیس شعبان ۱۲۶۶ھ) کو بادشاہ کے حضور میں پیش ہوئے۔ ظفر نے "نجم الدولہ دبیر الملک' نظام جنگ" کہہ کر خطاب کیا۔ کارپردازوں نے بادشاہ کے حکم سے چھ پارچے اور تین رقم جواہر کا خلعت پہنایا۔ پچاس روپیہ مشاہرہ مقرر ہوا اور یوں میرزا باقاعدہ قلعہ کے ملازم ہو گئے۔"[1]

۱۵۔ نومبر ۱۸۵۴ء کو ذوق کا انتقال ہو گیا اور میرزا اُستادِ شاہ مقرر ہوئے۔ بادشاہ کے علاوہ ولی عہدِ سلطنت میرزا محمد سلطان غلام فخر الدین رمز اور شہزادہ خضر سلطان بھی میرزا کے شاگرد ہو گئے تھے۔ میرزا بظاہر ہر طرف آسودہ حال ہو گئے۔ روپیہ پیسہ کی تنگی نہ رہی اس پر رتبہ یہ کہ استادِ شاہ اور تسکین کا سامان یہ کہ ظفر جیسے قدردانِ علم و ہنر سے وابستہ اب کوئی ایسی وجہ نہیں تھی کہ میرزا دربارِ معلی کو چھوڑ کر کسی اور طرف دیکھتے۔ اب تو سب کی نگاہیں میرزا پر پڑنے لگیں، واجد علی شاہ نے پانچ سو روپے سالانہ اپنی طرف سے جاری کر دیئے اس کے دوسرے سال ۱۸۵۵ء میں نواب یوسف علی خاں بہادر والیِ رامپور میرزا کے شاگرد ہوئے۔[2]

---

[1] کلیاتِ نثرِ فارسی ص ۲۷۱، ۲۷۲: بحوالہ مالک رام "ذکرِ غالب" ص ۱۱۳، ۱۱۵ چوتھا ایڈیشن

[2] پرتھوی چندر، "مرقعِ غالب" ص ۱۳، اشاعت اول

www.taemeernews.com

میرزا کا حریف گروہ گوشہ گمنامی میں جا پڑا تھا۔ میرزا کے شاگرد ہندوستان بھر میں پھیلے ہوئے تھے۔ ان کے اُردو اور فارسی کلام کے دواوین شائع ہو چکے تھے۔ اسی زمانے میں میرزا کی شہرت حیدرآباد میں بھی تھی۔ میرزا کے سب سے عقیدت مند اور حیدرآبادی شاگرد حبیب اللہ ذکا ہے میرزا کی خط و کتابت پتہ نہیں کب شروع ہوئی، اولین مکتوب جو ہمیں دستیاب ہو سکا ہے وہ ۳۰۔ جولائی ۱۸۶۴ء کا ہے لیکن ذکا اس سے پہلے ہی غالب سے متاثر ہو چکے تھے۔ حبیب اللہ ذکا کا مفصل ذکر آگے آئے گا یہاں یہ واقعہ بیان کر دینا ضروری ہے کہ ذکا آندھرا پردیش کے ضلع نیلور میں پیدا ہوئے اور انہیں اپنے وطن ہی میں غالب سے شدید عقیدت پیدا ہو چکی تھی:

"واقف حال اصحاب کا بیان ہے کہ یہ عقیدت دیوانگی کی حد تک جا پہونچی تھی اور ذکا ہر وقت اس کوشش میں رہنے لگے کہ غالب سے ملیں، تاقب[1] وقتاً فوقتاً حیدرآباد آتے تھے اور یہاں ان کے اعزاز میں مشاعرہ ہوتے تھے۔ ذکا کے دل میں بھی خیال پیدا ہوا کہ پہلے حیدرآباد پہونچنا چاہیے اور وہاں پہونچ کر غالب

---

[1] ذکا کے استاد

www.taemeernews.com

سے ملنے کی سبیل نکالنی چاہئے، چنانچہ وہ اپنے اقرباء کو خبر کئے بغیر گھر سے نکلے اور پیدل سفر کی صعوبتیں برداشت کرتے ہوئے حیدر آباد پہونچ گئے"[1]

ذکا ۱۲۷۲ھ م (۱۸۵۵ - ۱۸۵۶) میں حیدر آباد آئے۔[2] اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مرزا غالب کی مقبولیت نہ صرف شہر حیدر آباد بلکہ ریاست کے اطراف و اکناف کے اضلاع و تعلقوں میں بھی پھیل چکی تھی۔ یہ حال تو آندھرائی علاقوں کا تھا۔ علاقہ مہاراشٹرا میں میاں داد خاں سیاح اورنگ آبادی سے مرزا کی خط و کتابت بھی کم و بیش اسی زمانے میں شروع ہو چکی تھی۔ مرزا کا اولین خط جو سیاح کے نام ملا ہے وہ جون ۱۸۶۰ء کا ہے، لیکن یہ تعارفی یا پہلا خط نہیں معلوم ہوتا۔ سیاح نے اپنا پہلا طویل سفر ۱۸۴۶ء میں شروع کیا اور بنگالہ پنجاب، دکن، سندھ، کشمیر و قندھار سے ہوتے ہوئے ۱۸۶۰ء میں سفر سے واپس ہوئے۔ اسی سفر کے دوران میں سیاح غالب سے ملے ہیں۔[3]

---

[1] مولانا غلام رسول مہر خطوط غالب صـ ۴۵۹ تیسری اشاعت

[2] نواب عزیز جنگ، تاریخ النوائط صـ ۲۸۷، عزیز المطابع ۱۳۲۲ھ

[3] ڈاکٹر سید ظہیر مدنی، میاں داد خاں سیاح صـ ۱۸، مطبوعہ سب رس کتاب گھر۔

www.taemeernews.com

مرزا کے دوسرے مکتوب الیہم کے خطوط کی روشنی میں دیکھا جائے تو ہندوستان کے مختلف گوشوں میں اس وقت میرزا کے عقیدت مند موجود تھے۔

۱۸۵۰ء سے ۱۸۵۷ء تک کا زمانہ میرزا کی آسائش اور ان کے مشاعرانہ مرتبہ کے اعتراف کا زمانہ ہے۔

(۷)

۱۸۵۷ء میں وقت نے میرزا غالب ہی کیا پوری قوم کی طرف سے آنکھیں پھیر لیں۔ میرزا کے مربی یکے بعد دیگرے انقلابات زمانہ کا شکار ہو گئے، ان کے احباب اور خیر خواہ کچھ تو اس حادثہ میں مارے گئے اور جو بچ گئے تھے وہ خود قابل رحم تھے۔ یہ دور حقیقی مفہوم میں میرزا کی تنہائیوں کا دور ہے، اس تنہائی کو میرزا نے مراسلہ کو مکالمہ بنا کر دور کرنا چاہا۔۔۔ بڑھاپے میں مالی پریشانیوں نے انہیں پھر کسی صاحب نظر کا متلاشی بنا دیا۔۔۔ دس جولائی ۱۸۵۶ء کو میرزا فخرو نے ہیضہ سے انتقال کیا[1]۔ فروری ۱۸۵۶ء کو سلطنت اودھ کا خاتمہ ہو گیا، مئی ۱۸۵۷ء میں غدر ہو گیا، ستمبر ۱۸۵۷ء میں میرزا خضر سلطان

---

[1] مالک رام، ذکر غالب ص ۱۱۸ چوتھا ایڈیشن

www.taemeernews.com

گولی کا نشانہ بنا دیئے گئے۔ مغل سلطنت کا خاتمہ ہوگیا۔ غدر کے بعد میرزا کی آمدنی کچھ عرصہ کے لئے بالکل بند ہوگئی، اسی زمانے میں یعنی اٹھارہ اکتوبر ۱۸۵۷ء کی رات میرزا یوسف انتقال کر گئے۔ میرزا غالب کے لئے یہ زمانہ تمام مادی و روحانی تکالیف لے کر آیا۔

مارہرہ میں سید صاحب عالم سجادہ نشین "سرکار خورد" سے میرزا غالب کے دوستانہ اور عقیدت مندانہ تعلقات تھے، چودھری عبدالغفور سرور جو میرزا کے دوست اور شاگرد تھے سید صاحب عالم سے وابستہ تھے، صاحب عالم زبردست فاضل اور متبحر عالم تھے لیکن خط اچھا نہ تھا، لہذا جو خط لکھتے تھے چودھری عبدالغفور کے پاس بھیج کر صاف لکھواتے تھے[1]؛ یہی وجہ ہے کہ چودھری عبدالغفور کے نام میرزا غالب جب خط لکھتے تو اکثر ان میں سید صاحب عالم کو بھی مخاطب کرتے تھے۔ غالباً میرزا کی مذکورہ بالا پریشانیوں کے زمانے میں حضرت صاحب عالم مارہروی نے انہیں مشورہ دیا کہ نظام دکن کی مدح میں قصیدہ لکھ کر انہیں

---

[1] مولانا مہر

www.taemeernews.com

بھیجیں تاکہ وہ اس قصیدہ کو دکن بھیج سکیں۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ سید صاحب عالم کا حیدرآباد سے بھی ربط رہا ہے بلکہ یہاں اس قدر رسوخ بھی رہا ہے کہ وہ میرزا غالب کے لئے حیدرآباد میں کوشش کرنے کا ارادہ بھی رکھتے تھے۔ میرزا کی زندگی میں دکن جانے کا غالباً یہ دوسرا مشورہ تھا۔ پہلا مشورہ ابتدائے عمر میں ناسخ نے دیا دوسری دفعہ یہ مشورہ میرزا کے بڑھاپے میں سید صاحب عالم مارہروی دیتے ہیں۔ اس مرتبہ میرزا کے احساسات بالکل جدا نوعیت کے ہیں۔ اس عمر میں وہ اپنے آپ کو بڑا منحوس اور مریّخ سوز سمجھنے لگتے ہیں۔ حیدرآباد کی خوشحالی اور یہاں کے حالات سے میرزا خوش ہیں لیکن اپنی نحوست کے ڈر سے حیدرآباد آنا تو درکنار قصیدہ بھیجنے میں بھی تامل کرتے ہیں' چودھری عبدالغفور سرور کے نام میرزا نے ۱۸۶۰ء میں جو خط لکھا ہے اس میں درحقیقت ان کی مخاطبت سید صاحب عالم مارہروی سے ہے۔ صاحب عالم مارہروی کو اس خط میں میرزا نے جو کچھ لکھا ہے اس سے ان کے احساسات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ یہاں اسکے اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں:

"تحقیق کہ اب روے سخن جناب نقیض نصاب' جامع مدارج جمع الجمع' بزم وحدت کی فروزندہ شمع' مستغرق مشاہدہ شاہد ذات' حضرت صاحب عالم صاحب قدسی صفات کی طرف ہے اور یہ شعر افتتاح کلام ہے۔

www.taemeernews.com

پہلے کچھ باتیں، کہ بادی النظر میں خارج از مبحث معلوم ہونگی لکھی جاتی ہیں میں پانچ برس کا تھا کہ میرا باپ مرا، نو برس کا تھا کہ چچا مرا۔ اسکی جاگیر کے عوض میری اور میرے شرکاء حقیقی کے واسطے شامل جاگیر نواب احمد بخش خاں دس ہزار روپے سال مقرر ہوئے۔ انہوں نے نہ دیئے مگر تین ہزار روپے سال اس میں سے خاص میری ذات کا حصہ ساڑھے سات سو روپے سال میں نے سرکار انگریزی میں یہ عنبن ظاہر کیا۔ کولبرک[1] صاحب بہادر ریزیڈنٹ دہلی اور اسٹرلنگ[2] صاحب بہادر سکرٹر گورنمنٹ کلکتہ مقرر ہوئے میرا حق دلانے پر ریزیڈنٹ معزول ہو گئے۔ سکرٹر گورنمنٹ بمرگ ناگاہ مر گئے۔

بعد ایک زمانے کے بادشاہ دہلی نے پچاس روپے مہینہ مقرر کیا، ان کے ولیعہد[3] نے چار سو روپے سال۔ ولیعہد اس تقرر

---

[1] کولبروک ۱۸۲۷ء سے ۱۸۲۹ء تک ریذیڈنٹ رہا۔ پھر غالباً رشوت ستانی کی بنا پر الگ ہو گیا۔ (مولانا مہر)

[2] اسٹرلنگ ۱۸۱۳ء میں ہندوستان آیا۔ فارسی کا بڑا اچھا ذوق رکھتا تھا۔ حکومت ہند میں معزز عہدوں پر ممتاز رہا۔ ۱۸۳۰ء میں ۳۵، ۳۶ برس کی عمر میں وفات پائی۔ کلیات غالب (فارسی) میں اس کی مدح میں ایک قصیدہ اور وفات پر ایک قطعہ موجود ہے (مولانا مہر)

[3] شہزادہ فتح الملک بہادر عرف میرزا فخرو، بہادر شاہ کا ولیعہد۔ ۱۰۔ جولائی ۱۸۵۶ء کو وفات پائی۔ بیماری کی صورت ایسی تھی کہ بعض حلقوں میں زہر دیئے جانے کا شبہ پیدا ہوا۔ (مولانا مہر)

www.taemeernews.com

کے دو برس بعد مر گئے۔

واجد علی شاہ بادشاہ اودھ کی سرکار سے بہ صلہ مدح گستری

پانسو روپے سال مقرر ہوئے، وہ بھی دو برس سے زیادہ نہ

جیئے، یعنی اگرچہ اب تک جیتے ہیں، مگر سلطنت جاتی رہی اور

تباہی سلطنت دو ہی برس میں ہوئی۔ دلی کی سلطنت کچھ سخت

جان تھی۔ سات برس مجھ کو روٹی دے کر بگڑی۔ ایسے طالع مرتبی کش

اور محسن سوز کہاں پیدا ہوتے ہیں؟ اب میں جو والیٔ دکن کی طرف

رجوع کروں۔ یاد رہے کہ متوسط مر جائے گا یا معزول ہو جائے گا

اور اگر یہ دونوں امر واقع نہ ہوئے تو کوشش اس کی ضائع ہو جائیگی

اور والیٔ شہر مجھ کو کچھ نہ دے گا اور احیاناً اس نے سلوک کیا تو ریاست

خاک میں مل جائے گی اور ملک میں گدھے کے ہل پھر جائیں گے[1]

اے خداوند بندہ پرور، یہ سب باتیں وقوعی اور واقعی ہیں۔

اگر ان سے قطع نظر کر کے قصیدے کا قصد کروں،

قصد تو کر سکتا ہوں، تمام کون کرے گا؟ سوائے ایک ملکہ

کے کہ وہ پچاس پچپن برس کی مشق کا نتیجہ ہے، کوئی قوت باقی نہیں

---

[1] ظاہر ہے کہ مخاطب نے میرزا کے لئے حیدرآباد میں کوشش کرنے کا ارادہ کیا تھا۔
(مولانا مہر)

www.taemeernews.com

رہی کبھی جو سابق کی، اپنی نظم و نثر دیکھتا ہوں تو یہ جانتا ہوں کہ یہ تحریر میری ہے، مگر حیران رہتا ہوں کہ یہ نثر میں نے کیونکر لکھی تھی اور یہ شعر کیونکر کہے تھے؟ عبدالقادر بیدل کا یہ مصرع گویا میری زبان سے ہے:

عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ

پایانِ عمر ہے۔ دل و دماغ جواب دے چکے ہیں۔ سو روپے رامپور کے، ساٹھ روپے پنشن کے روٹی کھانے کو بہت ہیں۔ گرانی اور ارزانی امورِ عامہ میں سے ہے۔ دنیا کے کام خوش و ناخوش چلے جاتے ہیں۔ قافلے کے قافلے آمادۂ رحیل ہیں۔ دیکھو منشی نبی بخش مجھ سے عمر میں چھوٹے تھے۔ ماہ گذشتہ میں گزر گئے[1]۔ مجھ میں قصیدے کے لکھنے کی قوت کہاں؟ اگر ارادہ کروں تو فرصت کہاں؟ قصیدہ لکھوں، آپ کے پاس بھیجوں، آپ دکن کو بھیجیں، متوسل اک پیش کرنے کا موقع پائے، پیش کئے پر کیا پیش آئے؟ ان مراحل کے طے ہونے تک میں کیونکر جیوں گا؟

---

[1] منشی نبی بخش حقیر کے انتقال کا سال معلوم ہے، یعنی ۱۲۷۷ھ۔ غالب نے ان کی تاریخ کہی تھی

گفت مدہ طول دبگو "رستخیز"

اس سے ظاہر ہے کہ یہ خط ۱۸۶۱ء کا ہے۔ (مولانا مہر)

www.taemeernews.com

انا للہ وانا الیہ راجعون - لاالٰہ الا اللہ ولا معبود الا اللہ ولا

موجود الا اللہ، کان اللہ ولم یکن شئی واللہ الآن کما کان -

۱۸۶۰ء

(۹)

میرزا اگرچہ اپنی نحوست کے خیال سے والی دکن کا قصیدہ نہیں لکھنا چاہتے تھے لیکن اب سوائے حیدرآباد اور رامپور کے رہ کیا گیا تھا۔ رامپور سے تو میرزا کے تعلقات اچھے خاصے تھے اور سو دو سو روپے نواب یوسف علی خاں والی رامپور کے یہاں سے مل جاتے تھے اس کے علاوہ وقتاً فوقتاً میرزا کی طلب پر ضروریات کی کفالت کیلئے اور بھی روپیہ ملتا تھا۔ لیکن بقول سعدی

قرار در کفِ آزادگاں نگیرد مال

نہ صبر در دلِ عاشق نہ آب در غربال

قیاس کہتا ہے کہ مولانا عبدالرزاق شریف مدینہ نے اسی زمانے میں میرزا سے یہ بیان کیا کہ نواب شمس الامراء کی محفل میں میرزا کا تذکرہ ہوتا ہے، ادھر صاحب عالم کی خواہش، اور ادھر حیدرآباد کی بزم بائیگاہی میں اپنا ذکر سن کر میرزا کو تحریک ہوئی کہ شمس الامراء کو مخاطب کریں۔ چنانچہ ان کا وہ مکتوب جو شمس الامراء کے نام پنج آہنگ

www.taemeernews.com

میں شامل ہے وہ غالباً اسی دور کا ہے، اس مکتوب کے شروع و آخر میں میرزا نے مدحیہ اشعار لکھے ہیں۔ لہٰذا حیدرآباد میں غالب کے پہلے ممدوح امیر کبیر اول نواب فخر الدین خاں شمس الامراء دوم ہیں۔ میرزا نے شمس الامراء کے نام اپنے خط میں اپنی علمی اور ادبی زندگی کا مختصر سا تعارف کروایا ہے۔ اور یہ ذکر کیا ہے کہ سر سٹھ اشعار پر مشتمل ایک قصیدہ شمس الامراء کی مدح میں کہا ہے ایسا قصیدہ کہ جس کو پڑھ کر ممدوح کا دل پرسش کے لئے گرم اور آنکھیں نم ہو جائیں گی۔ افسوس کہ یہ قصیدہ کہیں نہیں مل سکا۔ خط کے آخر میں غالب نے لفظ قصیدہ لکھ کر دو شعر درج کئے ہیں جو حکیم عرفی کے مشہور قصیدہ کی زمین میں ہیں۔ میرزا کے شعر یہ ہیں:۔

اے مظہر کل در ازل آثار کرم را
منت بہ سر لوح زاسم تو قلم را
شمس الامراء کز شرف نسبت نامش
خور قبلہ بداد رنگ نشینان عجم را

میرزا کے کلیات نظم میں اس زمین میں ایک قصیدہ موجود ہے جس کا پہلا شعر یہ ہے:

اے ذات تو جامع صفت عدل و کرم را دے بر شرف ذات تو اجماع امم را

www.taemeernews.com

اس قصیدہ میں ستر اشعار ہیں لیکن ان میں وہ اشعار نہیں ہیں جو میرزا نے شمس الامرا کے خط میں لکھے ہیں۔ شمس الامرا نے اس خط کا کیا جواب اور اس قصیدہ پر کیا صلہ دیا اس کا بھی کوئی پتہ نہیں چلتا

(۹)

جیسا کہ ابتدا میں بیان کیا جا چکا ہے اس زمانے میں مختار الملک سر سالار جنگ اول کا ستارہ عروج پر تھا ریاست کے داخلی معاملات کے سوا انگریزوں کے یہاں بھی مختار الملک کا بڑا اثر و رسوخ تھا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ ریاست کے وزیر اعظم تھے۔ یہاں یہ ذکر بے محل نہ ہوگا کہ میرزا کے شیدائی شاگرد حبیب اللہ ذکا سالار جنگ کے یہاں صدر محاسبی کے میر منشی کی خدمت پر فائز ہو چکے تھے۔ ذکا نے سالار جنگ اول کی مدح میں متعدد قصیدے بھی کہے ہیں۔ ظاہر ہے ذکا نے یہ قصائد بغرض اصلاح میرزا غالب کے یہاں بھیجے ہوں گے، سالار جنگ اس وقت تک شخصی طور پر نہ سہی اور طور پر میرزا غالب سے خوب ہی متعارف ہوں گے۔ سالار جنگ اور سرسید کے مراسم گہرے تھے آثار الصنادید پر سالار جنگ نے میرزا غالب کی تقریظ دیکھی ہوگی۔ ویسے بھی مرزا غالب دربار معلی کے آخری ملک الشعرا تھے۔ ان سارے حالات کی روشنی میں اور

www.taemeernews.com

خصوصاً صاحب عالم مارہروی کی تحریک کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حالات نے مرزا کو مختار الملک سر سالار جنگ کی مدح میں قصیدہ لکھنے پر آمادہ کیا ہے، چونکہ ذکا ایک عرصہ تک مختار الملک کے دفتر انشا میں منشی رہ چکے تھے اور وہاں کے آئینِ دفترداری سے خوب واقف تھے لہذا قصیدہ کے بعد پیش کی جانے والی عرضداشت کا مسودہ ذکا ہی نے بنا کر بھیجا۔ مرزا نے قصیدہ و عرضداشت نواب مختار الملک کو بھیج دیا۔ یہ غالباً وہی قصیدہ ہے جس کا پہلا شعر ہے:

در مدح سخن چساں نگویم　　　شرطست کہ داستاں نگویم

یہ پورا قصیدہ اور اس کی تصویر اس کتاب میں پیش کی گئی ہے۔ اس قصیدہ کے آخر میں مرزا کی مہر بھی لگی ہوئی ہے۔ یہ میرزا غالب کی پانچویں[1] مہر ہے جس کی عبارت اسی طرح ہے "نجم الدولہ دبیر الملک اسد اللہ خاں بہادر نظام جنگ ۔ ۱۲۷۷ھ"۔ اس قصیدہ کے بعد کچھ عرصہ تک غالب بہت پر امید ہو جاتے ہیں چنانچہ ۱۷ستمبر ۱۸۶۱ء میں انھوں نے ذکا کو جو خط[2] لکھا ہے اس سے میرزا کے جذبات و

---

[1] مالک رام: غالب کی مہریں، ادبی دنیا اپریل ۱۹۳۱ء

[2] کلیات نثر غالب ص ۲۴۶ مطبوعہ نولکشور ۱۸۷۱ء

www.taemeernews.com

احساسات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اس خط میں میرزا نے ذکا کو لکھا ہے کہ اب گنجینۂ مراد کے ظاہر ہونے کا وقت آ پہنچا ہے اور یہ میری خوش قسمتی ہے کہ مجھ گوشہ نشیں کا نام اس دفتر ہمایوں میں لکھا گیا ہے اور پھر یہ شعر لکھا ہے

غالب بخود ببال کہ گشتیم روشناس در دفترِ وزیر نوشتند نامِ ما

اس کے بعد کی تحریر سے ظاہر ہوتا ہے کہ غالب نے اپنا قصیدہ اگست ۱۸۶۱ء میں بھیجا تھا اس کے بعد انہوں نے اپنے منتخب دیوان اردو کا ایک مطبوعہ نسخہ بھی مختار الملک کو بھیجا ہے۔ یہاں مرزا غالب نے اپنے مکتوب الیہ کو "حضرتِ فلک رفعت آصفِ سلیماں منزلت" سے یاد کیا ہے۔ جس سے یہ غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے کہ میرزا نے اپنا دیوان نائبِ دکن آصف جاہ کو بھیجا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ فقرے مرزا غالب کی حیدرآباد سے ناواقفیت اور یہاں کی سیاست میں ان کی بصیرت کے غماز ہیں۔ اس خط سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ پیش گاہِ وزارت سے ان کا مجموعۂ نظم فارسی طلب کیا گیا اور چونکہ دیوان اردو کی بابت پیش گاہ وزارت سے کچھ نہیں کہا گیا تھا۔ اس سے میرزا نے یہ مطلب نکالا کہ مجموعۂ اردو وہاں کارگر نہیں ہوا۔ مختار الملک سے تعلقات بڑھانے سے میرزا کے کیا کیا مقاصد وابستہ تھے یہ امر

www.taemeernews.com

بجائے خود تحقیق طلب ہے۔ تاہم اس سلسلہ میں میرزا کی کوششیں ایک عرصہ تک جاری رہیں لیکن بعض مخصوص حالات کی وجہ سے مرزا کی کارروائی تعویق میں پڑ گئی۔ ذکا اگرچہ حیدرآباد میں مرزا کی کارروائی کی پیروی کرتے رہے لیکن بعض غیر معمولی حالات میں پیروی ممکن نہ تھی۔ ذکا غالب کے قصیدہ کی رسید کی اطلاع دیتے ہوئے میرزا کو یہاں کے حالات سے اپنے ایک مکتوب میں اس طرح باخبر کرتے ہیں:

قصیدۂ مدحیہ بوصول پیوست۔ و ممدوحش با فراد دیدنی بہم بست۔ باید دید کہ ازیں بستن چہ می کشاید کہ اشارت بشارت را بکار آید۔ تا آن کہ کار روزگار دگرگوں شد دیر رحلت فخر الملک جگر خوں شد۔ ایں جاہ مند پایہ بلند آن است کہ نور دیدہ اش داور را فروغ شبستان است۔ تا سپہری شدن مدت عزا من کجا و انچہ من می جستم از کجا۔ ناگزیر فرسائش خامہ و آرائش نامہ پیش نہادی بود۔ و رسد امروزہ دل نواز صحیفہ تاکید بر آں افزود"

اس خط میں ذکا نے میرزا کو اطلاع دی ہے کہ ان کا قصیدہ وصول ہوا اور ممدوح کی نظر سے گذرا لیکن دیکھنا یہ ہے کہ اس کا نتیجہ کیا

لہ خاش خشماشش ص ۱۱، ۱۲ حبیب ذکا

www.taemeernews.com

نکلتا ہے، کیونکہ جب یہ قصیدہ سالار جنگ نے دیکھا اسی زمانے میں سالار جنگ کے خسر فخر الملک انتقال کر گئے۔ اور ذکا ایام عزا کی وجہ سے اس موقف میں نہیں تھے کہ پیروی کر سکیں۔ نواب میر غلام حسین خاں، صفدر جنگ حسام الدولہ فخر الملک کا انتقال[1] ۳۔ ڈسمبر ۱۸۶۱ء کی شب میں ہوا۔ گویا میرزا کا قصیدہ جو اگست ۱۸۶۱ء میں بھیجا گیا تھا وہ غالباً نومبر ۱۸۶۱ء میں مختار الملک نظر سے گذرا اور دسمبر کے اس حادثہ سے معرض التوا میں پڑ گیا۔

چند مہینے گذرنے کے بعد ذکا ایک اور خط میں میرزا کو لکھتے ہیں کہ ۱۰۔ مارچ کا لکھا ہوا خط ملا اور نواب مختار الملک کی نظر سے گذرا نیز ذکا نے میر دفتر، منشی عبد القادر، کو اس پر آمادہ کر لیا ہے کہ وہ دوبارہ قصیدہ کا ذکر چھیڑیں اور حضرت کی خوبیاں پھر بیان کریں، یہاں تک کہ گذارش دل نشین ہو جائے۔ ذکا مزید یہ اطلاع دیتے ہیں کہ مختار الملک کا دل میرزا کی کام بخشی پر مائل ہے اور مختار الملک نے ایک ایسا جواب دیا جو مصلحت آمیز تھا۔ لیکن اُس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ اس سے صلہ اور واسطہ دونوں ملیں گے۔

---

[1] کرونولوجی آف ماڈرن حیدرآباد صہ ۲۹۴، مطبوعہ ریاستی دفتر اسناد آندھرا پردیش

www.taemeernews.com

"پاسخ فرمودن مصلحت آمیز بمفادش این کہ صلہ ضرور است و واسطہ نیز" [1]

اسی خط میں ذکا میرزا سے یہ گذارش کرتے ہیں کہ وہ ان معاملات کو راز میں رکھیں، اور ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ ذکاؔ نے "واسطہ" کا جو لفظ لکھا ہے وہ اس مفہوم میں ہے کہ سالار جنگ میرزا غالبؔ اور حکومت برطانیہ کے درمیان واسطہ بنیں گے۔ کیونکہ خط اور قصیدہ کی نقل کا صاحب ایجنٹ دہلی کی وساطت سے بھیجے جانے کے امکان کا بھی یہاں ذکر ہے۔ یاد رہے کہ اس زمانے میں جب میرزا کی پنشن اور پھر دربار و خلعت جاری ہو گئے تو انہیں اپنا پرانا مطالبہ یاد آیا کہ انہیں ملکہ انگلستان کا شاعرِ دربار مقرر کیا جائے۔ بہت ممکن ہے اس معاملہ میں میرزا سالار جنگ سے وساطت کے خواہش مند ہوں کیونکہ حکومت برطانیہ میں ان کا بڑا اثر و رسوخ تھا۔

جب عرصے تک میرزا کو اپنی عرضداشت اور قصیدہ کا جواب نہیں ملا تو انھوں نے یاددہانی کے طور پر مختار الملک کے نام عرضداشت بھیجی اور یہ استفسار کیا کہ آیا میرزا کا قصیدہ ان تک پہنچا یا نہیں،

---

[1] خاش و خماش ص۱۳۔

www.taemeernews.com

پہنچا یا راہ میں تلف ہوگیا۔ اس عرضداشت کا مسودہ بھی ذکا نے بنا کر بھیجا تھا۔ یہاں مولوی موید الدین کا ذکر بے محل نہ ہوگا۔ مولوی صاحب، نواب سالار جنگ کے یہاں ایک ذمہ دار عہدہ پر فائز تھے اور دہلی کے متوطن تھے[1] نیز بقول میرزا:

"جناب مولوی موید الدین خاں صاحب کے بزرگواروں میں اور فقیر کے بزرگوں میں باہم وہ خلّت وصفوت مرعی تھی کہ وہ مقتضی اس کی ہوئی کہ ہم میں اور ان میں برادرانہ ارتباط و اختلاط باہم رہے اور ہمیشہ یوں ہی بلکہ روز افزوں رہے گا۔"[2]

جب مختار الملک کے یہاں سے جواب میں دیر ہونے لگی تو میرزا نے ذکا کو صورت حال سے واقفیت کے لئے بار بار لکھا۔ بالآخر ذکا نے یہ تجویز پیش کی کہ میرزا اس معاملہ میں مولوی موید الدین خانصاحب کو کیوں مخاطب نہیں کرتے، مولوی صاحب ہم وطن ہونے کے علاوہ میرزا کے مخلصوں میں سے ہیں[3]

میرزا نے اس کے بعد متعدد خطوط ذکا اور مولوی موید الدین کو

---

[1] خاتم وخمدانش ص ۹۲

[2] اُردوئے معلّٰی ص ۱۳۱، مطبع مجتبائی دہلی ۱۸۹۹ء

[3] خاتم وخمدانش ص ۹۲

www.taemeernews.com

لکھے اور نو خطوط مختار الملک کو لکھے، ذکا اور مولوی موید الدین نے اپنی سی کوشش کی، لیکن کچھ پیش نہیں گئی۔ مختار الملک نے ان لوگوں کی پیروی کی بناء پر دار الانشاء میں قصیدے اور عرضداشت کی تلاش کا حکم دیا لیکن غالباً کارپردازان دفتر کی شرارتوں سے یہ طویل کارروائی نتیجہ خیز نہ ہو سکی۔ اس کتاب میں سخن ہائے گفتنی کے زیر عنوان جو مکتوبات اکٹھا کئے گئے ہیں ان سے اس کارروائی کی الجھنوں پہ کافی روشنی پڑتی ہے۔ اس کارروائی نے اتنا طول کھینچا کہ میرزا کے کلیات نظم کا نیا ایڈیشن چھپ کر آگیا جس میں انہوں نے مختار الملک کی مدح میں لکھا ہوا قصیدہ بھی شامل کر دیا ۔ اور جب دفتر دار الانشاء میں قصیدہ ملنے کی امید نہیں رہی تو میرزا نے ذکا کو لکھا کہ یہ قصیدہ جو کلیات میں چھپ گیا ہے ممدوح کی نظر سے گذر سکتا ہے بظاہر میرزا کو اس سلسلہ میں کوئی کامیابی نہیں ہوئی اور وہ مایوس ہو کر بیٹھ رہے چنانچہ ذکا کو لکھتے ہیں۔

"ایک کم ستر برس کی میری عمر ہوئی سوائے شہرت خشک کے فن کا کچھ پھل نہ پایا۔ احسنت و مرحبا کا شور سامع فرسا ہوا۔ خیر ستائش کا حق ستائش سے ادا ہوا۔ مختار الملک نے یہ بھی نہ کیا۔ نہ مدح کی داد دی نہ مدح کا صلہ دیا۔ حیران ہوں کہ نواب

www.taemeernews.com

صاحب مجھے کیا سمجھے؟ محی الدولہ سے اور کچھ نہیں کہتا مگر یہ کہ
خدا سمجھے۔"[1]

یہ محی الدولہ کون تھے اس کا ذکر آئندہ باب میں کیا جائے گا۔

(۱۰)

۱۸۵۸ء سے میرزا پر قولنج کا پہلا حملہ ہوا، ۱۸۶۱ء میں میرزا بے حد نحیف و کمزور ہو گئے ۱۸۶۲ اور ۱۸۶۳ کا بیشتر حصہ ہچکیوں اور زخموں کی تکلیف میں بسر ہوا۔[2] ۱۲-مئی ۱۸۶۶ء کو اپنے حیدرآبادی شاگرد حبیب اللہ ذکا کو لکھتے ہیں:

"میرے محب، میرے محبوب،
تم کو میری خبر بھی ہے۔ آگے ناتوان تھا اب نیم جان ہوں آگے بہرہ تھا اب اندھا ہوا چاہتا ہوں، رامپور کے سفر کا رہ آورد ہے، رعشہ و ضعف بصر۔ جہاں چار سطریں لکھیں انگلیاں ٹیڑھی ہو گئیں، حرف سو جھنے سے رہ گئے اکہتر برس جیا، بہت جیا۔ اب زندگی برسوں کی نہیں، مہینوں اور دنوں کی رہ گئی ہے۔"

---

[1] مالک رام، ذکر غالب ص ۱۲۴، چوتھا ایڈیشن
[2] ایضاً ص ۱۶۰

www.taemeernews.com

۴۔ ڈسمبر ۱۸۶۶ ء کے ایک اور خط میں ذکا کو لکھتے ہیں، "اعصاب کے ضعف کا یہ حال ہے کہ اٹھ نہیں سکتا۔ اور اگر دونوں ہاتھ ٹیک کر چارپایہ بن کر اٹھتا ہوں تو پنڈلیاں لرزتی ہیں۔ لہٰذا دن بھر میں دس بارہ بار اور اسی قدر رات بھر میں پیشاب کی حاجت ہوتی ہے، حاجتی پلنگ کے پاس لگی رہتی ہے، اٹھا پیشاب کیا اور پڑ رہا۔ اسباب حیات میں یہ بات ہے کہ شب کو بدخواب نہیں ہوتا بعد اراقۂ بول بے توقف نیند آجاتی ہے۔"

میرزا کی صحت بڑی تیزی کے ساتھ مائل بہ زوال تھی انہوں نے فروری ۱۸۶۷ ء میں دہلی کے دو اخباروں اکمل الاخبار اور اشرف الاخبار میں اعلان چھپوا کر خط کے جواب اور اصلاح کلام کے معاملہ میں شاگردوں اور احباب سے معذرت چاہی[1]۔

ان حالات میں میرزا کے روابط شاگردوں اور احباب سے کم ہو گئے آمدنی کی جد و جہد کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، تاہم آمد و خرچ کا جو حال تھا وہ ۴۔ ڈسمبر ۱۸۶۶ ء کو ذکا کے نام لکھے گئے مکتوب کے ان جملوں سے معلوم ہو سکتا ہے۔

---

[1] مالک رام ذکر غالب ص ۱۶۴ بار چہارم

www.taemeernews.com

"ایک سو ساٹھ روپے کی آمد، تین سو کا خرچ، ہر مہینے
میں ایک سو چالیس کا گھاٹا، کہو زندگی دشوار ہے یا نہیں؟"[1]

یہ ایک سو ساٹھ روپے تو ظاہر ہے کہ مرزا کی پنشن اور رامپور کی امداد پر مشتمل تھے۔ رامپور سے مرزا کے تعلقات نواب یوسف علی خاں والیٔ رامپور (وفات ۱۸۶۵ء) کی زندگی تک نہایت خوشگوار تھے۔ ۱۸۶۵ء میں نواب کلب علی خاں تخت نشین ہوئے۔ ان سے میرزا کے تعلقات میں شروع ہی سے کچھ نہ کچھ بدمزگی پیدا ہوتی رہی۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ برہان قاطع اور قاطع برہان کا قضیہ جو ۱۸۶۲ء میں شروع ہوا تھا وہ میرزا کی وفات (۱۸۶۹) تک جاری رہا۔ میرزا عام معاملات میں اس قدر منکسر المزاج تھے کہ کسی بھی شخص سے اپنے آپ کو کمتر ماننے پر آمادہ ہو جاتے لیکن علمی معاملات میں اور بالخصوص زبان فارسی کے مسائل میں وہ کسی کو اپنا ہم چشم نہیں سمجھتے تھے۔ اس بارے میں ان کا رویہ اس قدر سخت و شدید تھا کہ علمی صداقت کے تحفظ کی خاطر وہ اپنی صحت، اپنی آمدنی بلکہ ذرائع آمدنی اور نیک نامی سب ہی کو جوکھوں میں ڈال دیتے، نواب کلب علی خاں، صاحب غیاث اللغات

---

[1] اردوئے معلیٰ ص ۳ مطبع مجتبائی نامی دہلی مطبوعہ ۱۹۰۸ء

www.taemeernews.com

کے شاگرد تھے، میرزا نے اپنی اس خستہ حالی میں بھی صاحب غیاث اللغات پر جو اعتراضات کئے تھے اس پر نواب صاحب کی حد درجہ خفگی کے باوجود میرزا نے اپنے استدلال کے پیرایوں کو بدل دیا لیکن اعتراضات واپس نہیں لئے۔ ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں کہ اس وقت میرزا کے لئے ملک بھر میں رامپور اور حیدرآباد کے سوا کوئی ایسی جگہ نہیں تھی جس سے وہ اپنی امیدیں وابستہ کرتے چنانچہ نواب کلب علی خاں والی رام پور کو میرزا نے ایک قطعہ بھیجا اور اس کے ساتھ یہ خط لکھا [1]

حضرت ولی نعمت آیہ رحمت سلامت

بعد تسلیم معروض ہے کہ ایک قطعہ پندرہ شعر کا بھیجتا ہوں، حضور ملاحظہ فرمائیں۔ مضامین کے طرز نئے مدح کا انداز نیا، دعا کا اسلوب نیا، زیادہ حد ادب۔

تم سلامت رہو ہزار برس ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

(۵ رجب ۱۲۸۴ھ) نجات کا طالب غالب

یہ خط ۳۔ نومبر ۱۸۶۷ء کا ہے اس خط کے ساتھ میرزا نے جو قطعہ بھیجا اسکے چند شعر یہاں پیش کئے جاتے ہیں:-

---

[1] مولانا امتیاز علی عرشی، مکاتیب غالب صفحہ ۹۹ مطبوعہ ۱۹۳۷ء

www.taemeernews.com

ہند میں اہلِ تسنّن کی ہیں دو سلطنتیں　　حیدرآباد دکن، رشکِ گلستانِ ارم
رامپور اہلِ نظر کی ہے نظر میں وہ شہر　　کہ جہاں ہشت بہشت آکے ہوئے ہیں بہم

حیدرآباد بہت دور ہے اس ملک کے لوگ
اُس طرف کو نہیں جاتے جو جاتے ہیں تو کم[1]

یہ اشعار مرزا نے گویا اپنے انتقال سے پندرہ مہینے پہلے کہے تھے۔ اس وقت تک رامپور اور حیدرآباد سے میرزا کی جو امیدیں وابستہ تھیں اُس کا مختصر سا جائزہ سطور ما سبق میں لیا جا چکا ہے۔ نواب شمس الامرار اور نواب مختار الملک کی مدح سرائی میرزا کی مشکلات کے ازالہ میں کچھ سود مند نہیں ہوئی۔ رامپور سے جو ملتا تھا سو ملتا تھا، مزید کی توقع فضول تھی۔ نیز ہر مہینہ جو گھاٹا آرہا تھا، اس بیماری ضعیف العمری اور ادبی معرکہ آرائی میں اس کی تلافی جس قدر ضروری تھی اس کی وضاحت کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ ایسے عالم میں میرزا کے لئے قصیدہ کہنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں تھا۔ برسوں پہلے سید صاحب عالم مارہروی کو میرزا نے جو خط لکھا ملاحظہ ہو صفحہ (۱۷ تا ۷۵) اس میں خود انہوں نے قصیدہ کہنے کے لئے اپنی ناطاقتی کا صاف صاف اظہار

---

[1] مولانا امتیاز علی عرشی، مکاتیب غالب، ص ۱۳۲ مطبوعہ ۱۹۳۷ء

www.taemeernews.com

کیا ہے۔ اب میرزا کے لئے ہندوستان بھر میں صرف ایک ہی شخصیت باقی رہ گئی تھی اور وہ نواب افضل الدولہ بہادر آصف جاہِ خامس والیٔ حیدرآباد دکن کی تھی۔ چنانچہ میرزا نے نواب افضل الدولہ بہادر کی مدح میں اکتیس شعر پر مشتمل ایک قصیدہ لکھا یہ قصیدہ مجموعہ میں شامل ہے جو انہوں نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں مرتب کرایا تھا اور جس کا قلمی نسخہ سید وزیرالحسن عابدی صاحب کے پاس ہے اس کا نام "سبدِ باغِ دودر" تھا۔ یہ دراصل "سبدِ چین" کا نقش ثانی تھا، ان کی وفات کے باعث یہ مجموعہ شائع نہیں ہو سکا۔ ..... سبدِ چین پہلی مرتبہ ۱۸۶۷ء میں شائع ہوا تھا، یہ قصیدہ اس میں شامل نہیں ہے اس سے خیال ہوتا ہے کہ شاید اس کے بعد لکھا گیا ہو۔"

ذکا کے نام میرزا کا آخری خط جو دستیاب ہو سکا ہے وہ ۲۷۔ جنوری ۱۸۶۸ء کا ہے اس خط میں میرزا نے نواب افضل الدولہ کے قصیدہ کا ذکر نہیں کیا ہے۔ یہ امر بھی تحقیق طلب ہے کہ میرزا یہ قصیدہ نواب افضل الدولہ کے پاس بھیج بھی سکے یا نہیں۔ تاہم یہ بات قرینِ قیاس ہے کہ جب انہوں نے اس قدر بلند پایہ قصیدہ لکھنے

لہ مالک رام نواب افضل الدولہ بہادر۔ آج کل دہلی فروری ۱۹۵۹ء

www.taemeernews.com

کی زحمت اٹھائی ہے تو ممدوح کے پاس بھیجا بھی ہوگا۔ اس قصیدہ کی تشبیب میں میرزا نے حیدرآباد دکن اور نواب افضل الدولہ کے عہد کی خوشحالی کی تعریف کی ہے۔ اس میں اس دور کے حیدرآباد دکن کو "روضۂ رضواں" اور یہاں کی سرزمین کو "آبِ گہر کے طوفان میں غرق" یہاں کی گردراہ کو "کحلِ صفاہاں" کہا ہے۔ نواب افضل الدولہ کو گریز میں اس طرح مخاطب کیا ہے:

شاہ فرخندہ فرا خسرو والا گہرا
چشم بدور کہ آدم بہ تو نازاں شدہ است

اس قصیدہ میں اس دور کے حیدرآباد کے علمی اور دینی ماحول کی طرف بھی کچھ اشارات ہیں۔ اس کے بعد میرزا اپنا تعارف کرواتے ہیں کہ وہ آلِ سلجوق سے اک رندِ روشن نفس ہیں اور نواب افضل الدولہ کے دسترخوان پر مہمان ہیں' اپنے ممدوح سے کہتے ہیں کہ وہ ایسا سمجھیں کہ دہلی سے ایک مسافر دکن آیا ہے اور دور سے اُن کا ثنا خواں ہے:

رندِ روشن نفسے ہست ز آلِ سلجوق
ایں کہ بر مایدۂ فیضِ تو مہماں شدہ است
تو چناں داں کہ غریبے ز دیارِ دہلی
بہ دکن آمدہ از دور ثنا خواں شدہ است

اس قصیدہ کا آخری حصہ میرزا کے آلام اور آخری زمانے میں ان کی دردناک

www.taemeernews.com

زندگی کی حقیقی تصویر ہے۔ میرزا نے آخر میں کہا ہے کہ ان کا غنچۂ دل اب کھلنے سے ناامید ہو چکا ہے وہ صرف اپنے "دمِ گرم" کی وجہ سے زندہ ہیں لیکن مصائب کی وہ شدت ہے کہ دل، روح کی غذا بن گیا ہے یہاں غالب نے کسی حسن طلب سے کام نہیں لیا ہے بلکہ صاف الفاظ میں کہا ہے، کہ غالب ایک درویش غم زدہ ہے اور ممدوح درویش نواز غالب ایک پیر کہن ہے اور شیئاً للہ کی آواز لگاتے ہوئے ممدوح کے دروازے پر گدا کی طرح آیا ہے۔

این کہن پیر با آوازۂ شیئاً للہ
گدیہ گر بر در آں قبلۂ کیہاں شدہ است

مرزا کو اپنے سابقہ حیدرآبادی ممدوحین سے یہ شکایت رہی تھی کہ وہ صلہ تو درکنار سخن کی داد اور خط کی رسید بھی نہیں دیتے۔ چنانچہ اس قصیدہ میں انہوں نے ممدوح سے کہہ دیا ہے کہ اگر وہ صلہ نہیں دیتا ہے تو نہ دے کم از کم ستائش سے نواز دے۔

صلہ گر می نہ فرستی، بہ ستائش بنواز
کایں کلامے ست کہ داغِ دلِ حساں شدہ است

پتہ نہیں "داغِ دلِ حسان[1]" کا اثر نواب افضل الدولہ پر کیا ہوا۔

---

[1] حضرت حسان بن ثابتؓ مشہور صحابی گذرے ہیں جو بڑے قادر الکلام شاعر تھے اور مدح پیغمبری میں ان کے قصائد بے مثال سمجھے جاتے ہیں۔

www.taemeernews.com

اس سے پہلے میرزا جب قصیدہ لکھتے ہیں، خواہ وہ حیدرآبادی ممدوحین کی مدح میں ہوں یا انگریزوں کی یا کسی اور کی اس معاملہ میں ان کا طرز عمل بالعموم یہ رہتا تھا کہ وہ قصید بھیجنے کے لئے مناسب توسط اختیار کرتے اور قصیدہ بھیجنے کے بعد ممدوح کے ردعمل سے باخبر رہنے کی کوشش کرتے۔ نواب مختار الملک کو میرزا نے جو قصیدہ بھیجا اور اس کے بارے میں جو کارروائی اور پیروی ہوئی اس کا حال ہم دیکھ چکے ہیں لیکن نواب افضل الدولہ کی مدح میں غالب نے یہ قصیدہ، معلوم ہوتا ہے، نہایت خاموشی اور راز میں بلا کسی توسط کے راست طور پر بھیجا یہی وجہ ہے کہ میرزا کے کسی خط میں اس کا ذکر نہیں ملتا۔ سر سالار جنگ کے یہاں میرزا کا قصیدہ اور نوع ضد استیں پہلے سے پڑی تھیں ان کا توسط اختیار کرنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

غلام امام شہید کا رنگ حیدرآباد میں اس طرح جما ہوا تھا کہ نواب محی الدولہ اور راجہ گردھاری پرشاد باقی ان کے دلدادہ ہو گئے تھے، محی الدولہ نے تو یہاں تک کیا کہ میرزا کے کلام کو نظر انداز کر دیا، غلام امام شہید سر سالار جنگ کو متاثر کرنے کی کوشش میں تھے، میرزا ان سارے حالات کو اپنے لئے ناسازگار سمجھتے تھے۔ ایسے ناسازگار ذہنی ماحول سے اگر کوئی شخصیت بالاتر تھی تو وہ نواب افضل الدولہ کی شخصیت

تھی۔ لہذا ایسے ماحول میں کھلے طور پر نواب افضل الدولہ کو قصیدہ بھیجنا کسی طرح قرین مصلحت نہیں تھا۔ رہا معاملہ ستائش و صلہ کا تو اس کی دو صورتیں ہو سکتی تھیں۔ ایک تو یہ کہ نواب افضل الدولہ یہ قصیدہ دفتر دیوانی بھیجتے اور سرکاری طور پر صلہ کی کاروائی ہوتی۔ اس سلسلہ میں ہم نے جہاں تک چھان بین کی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ ایسا نہیں ہوا، دفاتر دیوانی میں ایسا کوئی ریکارڈ موجود نہیں، دوسری صورت یہ تھی کہ اس قصیدہ پر علاقہ صرفخاص مبارک میں کاروائی ہوئی ہو اگر یہ قصیدہ ان تک پہنچا ہے تو اسکی کاروائی صرفخاص ہی میں ہوئی ہوگی۔ صرف خاص میں اہل علم و ہنر کو نوازنے کے کئی صیغہ ہائے راز تھے۔ نواب افضل الدولہ نے جو بھی دیا ہوگا اسکی ترسیل بھی صیغہ رازہی میں عمل میں آئی ہوگی۔

میرزا نے یہ قصیدہ اپنی زندگی کے جن حالات میں لکھا ہے ان کا اندازہ ان خطوط سے کیا جا سکتا ہے جو ۱۸۶۱ اور ۱۸۶۸ کے دوران میرزا نے نواب کلب علی خاں والیٔ رامپور کو لکھے ہیں[1]۔ ان خطوط و نیز معرکہ برہان قاطع اور میرزا کی صحت کے پیش نظر ہمارا یہ قیاس ہے کہ یہ قصیدہ مرزا نے اواخر ۱۸۶۸ء یا جنوری ۱۸۶۹ء میں لکھا ہوگا۔ اور نواب افضل الدولہ آصفجاہ خامس ان کے آخری ممدوح تھے۔ میرزا کا انتقال* ۲۶۔ فروری ۱۸۶۹ء کو ہوا نہ قصیدہ نگار باقی رہا نہ ممدوح۔ اہل کرم کا تماشائی تو اٹھ گیا لیکن اپنے ممدوحین کے خاندانوں کو اپنے قصیدوں سے مفتخر کر گیا۔

* ۱۵/ فروری ۱۸۶۹ء کو عصر کے بعد ہوا اور ان کی عمر ۷۲ سال

[1] مکاتیب غالب ص ۸۹ تا ۱۰۸ مرتبہ مولانا امتیاز علی عرشی، مطبوعہ بمبئی ۱۹۳۷ء

www.taemeernews.com

ادبی تعلّقات

جہاں تک حیدرآباد کی علمی اور دانشورانہ زندگی کا تعلق ہے وہ میرزا غالب سے اور میرزا غالب اس سے بے خبر و بے گانہ نہیں تھے۔ میرزا کے بعض شاگردوں کا ذکر ابتدائی مباحث میں ضمناً آچکا ہے ان کے شاگردوں میں حبیب اللہ ذکا کا نام سرفہرست ہے ذکا اور غالب کے تعلقات سے غالب اور حیدرآباد کے موضوع پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ ذکا کے علاوہ قربان علی سالک اور میاں داد خاں سیاح بھی غالب کے حیدرآبادی شاگرد ہیں ان سب کو میرزا سے قربِ خاص حاصل رہا ہے

حبیب اللہ ذکا حبیب اللہ ذکا عربوں کے قبیلہ نائط سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے آبا و اجداد دکن کی ریاستِ بیجاپور میں آکر

www.taemeernews.com

مقیم ہو گئے، ذکا کے جدِ اعلیٰ مصطفیٰ علی خاں نواب اودگیر کی طلب پر کرناٹک آئے اور آندھرا پردیش کے ضلع نیلور میں سکونت پذیر ہوئے ذکا کے والد حافظ محمد میراں نائطی ابن حافظ محمد علی نائطی اس طبقہ کے مشاہیر سے گذرے ہیں۔ حافظ محمد میراں کے دو بیٹے ہیں، ایک محمد حبیب اللہ ذکا دوسرے محمد رحمت اللہ رسا، دونوں بھائیوں نے علم و ادب میں کمال حاصل کیا اور اچھی خاصی ترقی کی۔

ذکا ۱۲۴۴ھ (م ۲۹ - ۱۸۲۸ء) میں نیلور میں پیدا ہوئے شروع میں اپنے بڑے بھائی محمد رحمت اللہ رسا سے کچھ فارسی پڑھی۔ اس کے بعد مدراس پہنچ کر سید محمد ثاقب اور سید محمد بنیش سے عربی و فارسی کی متداولہ کتابیں پڑھیں۔ ثاقب اور بنیش دونوں حقیقی بھائی تھے، ان کے جدِ اعلیٰ مشہد سے ہندوستان آئے تھے۔ یہ دونوں بھائی مدراس میں فارسی شاعری کے استاد مانے جاتے تھے۔ ذکا ابتدا میں ان ہی سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔ ذکا کا قیام اگرچہ نیلور میں تھا لیکن وہ گاہے ماہے مدراس جاتے اور ارکاٹ کے نواب والاجاہ محمد غوث خاں بہادر کے یہاں مشاعروں میں حصہ لیتے تھے۔ ان مشاعروں میں شرکت سے ان کی شعری صلاحیت کو بڑی آب و تاب ملی۔ ذکا کی زبان میں لکنت تھی اس لئے وہ اپنا کلام مشاعروں میں کسی اور سے پڑھواتے تھے۔

www.taemeernews.com

پچیس چھبیس برس کی عمر میں ذکا کے شعر و سخن کا آوازہ جنوبی ہند میں بلند ہو چکا تھا۔ تذکرۂ گلزار اعظم ۱۲۷۲ھ (۵۶ - ۱۸۵۵ء) میں چھپا اس وقت ذکا کی عمر ۲۷ برس کے لگ بھگ ہو گی اس تذکرہ میں ذکا کا ذکر جس طرح کیا گیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت کے علمی ماحول میں ذکا ایک نمایاں مقام حاصل کر چکے تھے۔ اسی زمانے میں ذکا کو میرزا غالب کی نظم و نثر فارسی دیکھنے کا اتفاق ہوا اور وہ میرزا کے ہنر اور ان کی شخصیت دونوں پر فریفتہ ہو گئے اور ان کے دل میں میرزا سے ملنے کی شدید آرزو پیدا ہو گئی۔ مولانا مہر فرماتے ہیں: "ذکا کو غالب سے غائبانہ عقیدت پیدا ہو گئی، واقف حال اصحاب کا بیان ہے کہ عقیدت دیوانگی کی حد تک جا پہنچی تھی اور ذکا ہر وقت اس کوشش میں رہنے لگے کہ غالب سے ملیں۔ ثاقب وقتاً فوقتاً حیدرآباد آتے تھے اور یہاں ان کے اعزاز میں مشاعرے ہوتے تھے۔ ذکا کے دل میں بھی خیال پیدا ہوا کہ پہلے حیدرآباد پہنچنا چاہیے اور وہاں پہنچ کر غالب سے ملنے کی سبیل نکالنی چاہیے۔ چنانچہ وہ اپنے اقربا کو خبر کیے بغیر گھر سے نکلے اور پیدل سفر کی صعوبتیں برداشت کرتے ہوئے حیدرآباد پہنچ گئے۔"[1]

خود ذکا کے ایک مکتوب سے، جو انھوں نے مرزا غالب کو لکھا اس بیان

[1] مولانا مہر خطوط غالب ص ۲۶ بار سوم

www.taemeernews.com

کی تصدیق ہوتی ہے، ذیل کا اقتباس ملاحظہ ہو

"از خاک سرزمین مدراس[1] سر برکردہ۔ بتلاشِ آموزگاران سخن پائے از سر کردہ۔ تا آن کہ در سیر گلشن بخارگیرائے شیوا شیوہ ملا زمان از جا بردیم۔ و با عزم سفر ہندوستان تا حیدرآباد دکن آوردہ۔"[2]

حیدرآباد آنے سے پہلے ذکا نے دیوانِ وقت مختارالملک کے "نظم امور" کا "طنطنہ" اور "قدر دانی" کا "آوازہ" اپنے وطن ہی میں سنا تھا اور یہاں یہ امید لے کے آئے تھے کہ سالار جنگ کی ملازمت میں انہیں جگہ مل جائے گی، یہاں پہنچنے کے بعد کم وبیش ایک سال تک وہ کسی ایسے وسیلہ کی تلاش میں سرگرداں رہے جو انہیں مختارالملک تک پہنچا دے۔ آخر کار عبدالوہاب حسینی نامی ایک شخص نے ان کی مدد کی، ذکا نے مختارالملک کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا جسے ایک عرضداشت کے ساتھ اُن کی خدمت میں پیش کیا، اس کے بعد تین مہینے سے زیادہ عرصہ گذرنے پر ۳۔ اگست ۱۸۵۹ء کو نواب مختارالملک نے انہیں اپنے پاس ملازم رکھ لیا اور منشی خانے میں ایک خدمت تفویض کی، دس

---

[1] یاد رہے کہ جس زمانے میں یہ خط لکھا گیا، اس وقت ضلع نیلور صوبۂ مدراس میں تھا۔

[2] خاش وخاش ص

www.taemeernews.com

سال تک وہ دارالانشا ہی میں ملازم رہے۔ ۱۸۶۴ء ۶۵ء میں انتظام امور مالگذاری کیلئے ایک مخصوص مجلس کا انعقاد عمل میں آیا جس کے نتیجہ میں منشی خانے کے عملہ کا ایک خاصہ حصہ صدر محاسبی میں منتقل ہوگیا۔ اس کے چند دنوں بعد ذکا کو علاقہ دیوانی میں ناگرگرنول کی سوم تعلقداری اور پھر دوم تعلقدار کے عہدے پر فائز کیا۔[2]

اس زمانے میں حیدرآباد میں حافظ شمس الدین فیضؔ کا طوطی بول رہا تھا، فیض اپنے وقت کے اُردو کے ممتاز شاعر تھے، ذکا نے فیض سے غالباً اپنا اُردو کلام رجوع کیا۔ ذکا دراصل فارسی کے شاعر تھے، اُردو میں بھی انہوں نے شعر کہے ہیں لیکن اس کو قابل اعتنا نہیں سمجھا اس زمانے کے مدراس کے ادبی حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ بات آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے کہ ذکا نے اپنا اُردو کلام پہلے میرزا غالب کو نہیں دکھلایا بلکہ شمس الدین فیض کو دکھلایا۔ ذکا میرزا کو زیادہ تر فارسی کلام ہی دکھلاتے اور فارسی ہی میں لکھا کرتے تھے جس پر ایک مرتبہ میرزا نے اس طرح طنز کی ہے:

---

[1] غلام صمدانی گوہر، تزک مجبوبیہ جلد دوم دفتر ہفتم ص ۶۳، ۱۹۰۳ء

[2] خاش و خماش ص ۱۳۲

www.taemeernews.com

"آپ دلایتی بھی نہیں جو میں یہ تصور کروں کہ اُردو عبارت سے
استنباط مطلب اچھی طرح نہ کر سکیں"

بہر حال حیدر آباد پہنچنے کے بعد ذکا کو اپنی دیرینہ آرزو پوری کرنا تھی، چنانچہ انہوں نے میرزا غالب کو پہلا خط لکھا جس کے مطالب کا خلاصہ یہاں پیش کیا جاتا ہے:

"عالی خدمت نواب اسد اللہ غالب تخلص،

آن کہ در حضرت او خامہ بہ عرض ادب است
شاہِ مردانِ سخن غالب عالی نسب است

بندگی ہا مقبول، کورنش ہا موصول باد۔ بندہ نے کبھی "روئے خواجہ" نہیں دیکھا لیکن "موئے خواجہ" کا گرویدہ ہو گیا ہے، اگر اس کا نام پوچھیں تو ذکا ہے اور مقام پوچھیں تو لاپتہ ہے، مخاطب کے کلام کی بلندی فکر اور دقّت معنی تک پہونچنے کی کوشش میں میں نے فلک چہارم سے تحت الثریٰ تک کی سیر کی ہے، اس کو غلو سمجھیں اور مستانہ کا اٹھنا اور گرنا سمجھیں یہ ایک تیز شراب کا نشہ تھا تکلف اور کنایہ سے کہاں تک کام لوں۔ شراب سرجوش سے مراد کیفیت پنج آہنگ اور دستنبو اور مہر نیمروز ہے جن کا ایک ایک نسخہ حاصل کرنے کے لئے مجھے مہینوں جستجو کرنا پڑی، میں خوش قسمت ہوں، فرخ ہوں کہ ان سے جو نشاط

www.taemeernews.com

حاصل ہوئی اُس کی حرص آج تک باقی ہے اس خیال میں کہ کوئی شخص ہندوستان سے اس طرف کا قصد کرے گا، اور جناب والا کا کلیات فارسی و "ماہ نیم ماہ" اس کے پاس ہوگا سرِ راہ بیٹھا ہوا مسافروں کے نقشِ پا کی پرستش کر رہا ہوں اگر اتنی پرستش آفتاب کی کرتا تو مجھے لعلِ ناب کا آب و رنگ نصیب ہوتا، اور اگر اس قدر انتظار باغبانی میں کرتا تو میرا نہال برگ و بار سے گلفشاں ہوتا، ان سب باتوں کے باوجود وہ دلنشین کتابیں مجھے نہیں ملیں لیکن میں نے اپنے آپ کو یہ طعنہ نہیں دیا کہ میں نے ایک بیہودہ کوشش کی، آرزو کا خون ہو گیا، تب کہیں دل نے رہنمائی کی کہ وہ پھول جو بازار میں نہیں ملتا گلستان سے اس کی بھیک کیوں نہ مانگی جائے۔ چشمہ سے اگر پانی نہ ملتا ہو تو ابر رحمت سے درخواست کیوں نہ کی جائے۔ اسی امید میں یہ سطور تحریر کر رہا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ میرے دست گدائی پر نوازش ہوگی اور وہاں ایک کاتب مقرر کیا جائے گا جو وہاں صفحہ پر سیاہی اور یہاں میرے دل پر احسان کا نقش کھینچے گا۔" [1]

اس کے بعد ذکا نے جواب کے لئے اپنا حسب ذیل پتہ

---

[1] خاش و خماش ص۵

www.taemeernews.com

درج کیا ہے:-

"درحیدرآباد۔ دکن بہ دارالانشار مہین دستور مختارالملک
بہ حبیب اللہ ذکا برسد"۔[1]

یہاں سے میرزا غالب اور ذکا کی خط وکتابت کا آغاز ہوتا ہے ذکا کے اس خط پر تاریخ کا اندراج نہیں ہے۔ تاہم انہوں نے یہ خط اس وقت لکھا ہے جب وہ مختارالملک کے یہاں ملازم ہو چکے تھے اس لحاظ سے یہ خط ۲ راگست ۱۸۵۶ء کے بعد کا لکھا ہوا ہے، میرزا کا جو اولین خط ذکا کے نام مل سکا ہے وہ ۱۷ ستمبر ۱۸۶۱ء کا ہے گویا ذکا کا ربط میرزا غالب سے بذریعہ مراسلت ۱۷ ستمبر ۱۸۶۱ء سے پہلے قائم ہو چکا تھا۔ میرزا کا مذکورہ مکتوب غالباً ذکا کے پہلے خط کے جواب میں ہے جس میں میرزا نے ماہ نیم ماہ کی فرمائش پر یہ لکھا:

زہے تصور باطل زہے خیال محال، ماہ نیم ماہ ایک ایسا اسم ہے جس کا مسمّیٰ نہیں ہے، اس کے بعد میرزا نے اپنی تصنیفات کی مختصر روداد لکھی ہے کہ ان میں کون سی چھپ چکی ہیں۔ کونسی بازار میں مل سکتی ہیں اور کونسی تصنیفات نایاب ہو چکی ہیں۔ میرزا کے اس مکتوب

---

[1] خاش دخماش ص۵

www.taemeernews.com

کا جواب جو ذکا نے لکھا وہ عشق و عقیدت میں ڈوبا ہوا ہے، ذکا نے
ابتدا ایخط القاب کے بجائے ان کلمات سے شروع کیا ہے:
"در آیہ ادعونی فاستجب لکم[1] راد لنشیں تفسیرے۔ وہ وعدہ
یعطیک ربک فترضیٰ[2] را جانفزا تاویلے"
ذکا نے اس خط میں اطلاع دی ہے کہ دیوانِ اُردو جس کے
بھیجنے کا ذکر میرزا نے کیا تھا وہ نہیں پہنچا اور پہنچا ہو تو کسی نے اسے
دیکھا نہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرزا نے اپنے مکتوب کے
عنوان میں ذکا کے نام کے ساتھ "مولوی" اور "خان" کے الفاظ لکھے
تھے اور مکتوب میں یہ تو پوچھا ہی تھا کہ ذکا کس منصب پر فائز ہیں، ذکا
نے اس کا جواب مرزا کے اس مصرعے سے شروع کیا ہے
"گرنی تھی ہم پہ برق تجلی نہ طور پر"
اور لکھا ہے کہ نہ انہیں "مرتبہ مولویت" حاصل ہے اور نہ "خطاب خانی"

---

[1] آیہ قرآن مجید وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ پ ۲۴ ۱۱ مومن ۴۰ ۶۰ (اور تمہارے
پروردگار نے فرما دیا ہے کہ مجھ کو پکارو میں تمہاری درخواست قبول کر لوں گا) کی طرف اشارہ ہے
[2] آیہ قرآن مجید وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضَىٰ پ ۳۰ ۱۸ ضحیٰ ۹۳ ۵ (اور عنقریب
اللہ تعالیٰ آپ کو دے گا سو آپ خوش ہو جائیں) کی طرف اشارہ ہے۔

www.taemeernews.com

بلکہ وہ "نام آور عالم بے نشانی" ہیں۔ اسی خط میں ذکا نے بیان کیا ہے کہ وہ کن حالات میں حیدرآباد آئے اور سات سال سے دارالانشاء کے کارپردازوں میں ملازم ہیں۔

میرزا غالب کے نام ذکا کے گیارہ خطوط "خاش وخماش" میں شامل ہیں۔ یہ تمام خطوط غالبیات کے مآخذ میں اہم مقام رکھتے ہیں، میرزا نے ایک خط کے سوا جو فارسی میں ہے ذکا کو ہمیشہ اردو میں خط لکھا ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے ذکا ہمیشہ فارسی ہی میں جواب دیا کرتے تھے۔ حتیٰ کہ جب ذکا نے اپنے فارسی نظم ونثر کے مجموعہ "خاش وخماش" کے لئے میرزا سے تقریظ کی فرمائش کی تو انہوں نے تقریظ بھی اُردو میں لکھ کر بھیجدی۔ میرزا کے جتنے خطوط ذکا کے نام ملتے ہیں، کم وبیش ان میں سے ہر ایک پر تاریخ کا اندراج ہے لیکن افسوس یہ ہے کہ ذکا کے خطوط پر تاریخوں کا اندراج نہیں ہے تاہم خطوط کے اندراجات کی روشنی میں ان تاریخوں کا تعین کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس بحث طلب موضوع پر کچھ کہنے کی اسوقت گنجائش نہیں ہے یوں معلوم ہوتا ہے، ذکا کے فارسی خطوط کا پھیلاؤ بھی اسی مدت پر ہے جس مدت پر ذکا کے نام مرزا کے خطوط پھیلے ہوئے ہیں گویا ۱۸۶۱ء سے ۱۸۶۸ء تک۔

ذکا کے میرزا غالب سے تین طرح کے تعلقات تھے، پہلا تعلق شخصی

www.taemeernews.com

اور استادی و شاگردی کا تھا جس کا اندازہ ان خطوط سے ہو سکتا ہے جو ان اوراق میں شامل کر دیئے گئے ہیں۔ ان خطوط میں میرزا غالب سے ذکا کے تلمذ کا آغاز ان کے کلام پر میرزا کی رائے اور اصلاح کی تفصیلات ملتی ہیں اور اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ استاد و شاگرد میں کسقدر محبت تھی۔ ان خطوط کے القاب و آداب اس محبت کے آئینہ دار ہیں۔

دوسرا تعلق میرزا کے قصیدوں کی ستائش و صلہ کے ضمن میں ذکا کی پیروی و رہنمائی کا تھا جس پر گذشتہ اوراق میں بحث کی جا چکی ہے۔ اس تعلق سے ذکا نہیں دستور مختار الملک کے دفتر میں اپنے مقام و حیثیت کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں لیکن اپنی سی کئے جاتے ہیں۔ جس کا اعتراف مرزا غالب اس طرح کرتے ہیں :

> "قصیدہ و غزل میں صلہ و تحسین بہ اقتضائے قسمت ہے، نہ بہ اندازۂ ارزشِ کلام۔ ممدوح سخن فہم ہوتا تو مجھ کو متوسط کے تساہل کا وہم ہوتا، اغنیا کو نہ مذاقِ شعر سے نسبت نہ مطالعہ اشعار کی فرصت، متوسط نے بقدر ہمت سلسلہ جنبانی کی لیکن مرجع نے نہ قدردانی کی۔"[1]

تیسرا تعلق وہ ہے جو حیدرآباد کے علمی و ادبی ماحول کے بارے میں میرزا کے طرزِ عمل پر مبنی ہے۔ یہاں اس کا اجمالی جائزہ لیا جائے گا۔

---

[1] مکتوب ۱

www.taemeernews.com

میرزا شہر حیدرآباد کے علمی اور دانشورانہ ماحول سے خود کو باخبر رکھتے تھے۔ یہاں یہ ذکر بے محل نہیں ہوگا کہ مولانا سید احمد شہید اور مولانا اسمٰعیل شہید کی تحریکیں شمالی ہند میں دیگر کئی نئی تحریکوں کی شکل اختیار کر رہی تھیں لیکن دکن میں اس زمانے میں ان تحریکوں کے نظریاتی مویدین کا ایک طبقہ اس وقت بھی موجود تھا۔ مقلدین اور غیر مقلدین میں مباحثے ہوا کرتے تھے۔ غیر مقلدین کی تعداد بہت کم تھی کیونکہ اس زمانے کے حیدرآباد کے نقشے میں اورنگ آباد، گلبرگہ، بیدر، اور رائچور بھی شامل تھے حقیقی معنوں میں یہ ریاست گنج اولیا تھی۔ ہر طرف خمخانۂ تصوف کی سرشاریاں تھیں۔ ان حالات میں وہابی تحریک کو یہاں قبول عام حاصل ہونا ممکن نہ تھا۔ لیکن خال خال جو غیر مقلدین تھے، وہ بڑے کٹر نہایت پرجوش اور حد درجہ نڈر تھے چونکہ یہ طبقہ شعوری طور پر غیر مقلدانہ مسلک سے متاثر ہوتا تھا اور اس مسلک کی بنیادیں علمی اور منطقی ہوتی تھیں اس لئے ان میں علوم منقول سے اثبات اور بحث میں استدلال کی صلاحیت مقلدین کی نسبت کہیں زیادہ ہوتی تھی۔ یہ لوگ بالعموم وہابی، غیر مقلد یا اہلحدیث کہلاتے تھے۔ مقلدین کو اس کی فکر رہتی تھی کہ کوئی ایسا عالم مل جائے جو احادیث کی روشنی میں ان کے صوفیانہ اور آزادانہ رسوم و رواج کی صحت ثابت کر دے یا کم از کم ان کی کمزوریوں اور کوتاہیوں

www.taemeernews.com

کو گرفت میں لائے۔

مولانا حالی اور غالب کے دوسرے اہم طالب علم متفق الآرا ہیں کہ غالب شخصی طور پر اور اپنے مزاج کے اعتبار سے اس تحریک کے حامیوں میں سے تھے، لیکن مولانا فضل حق خیر آبادی جو مرزا کے نہایت عزیز دوست اور مقلد طبقہ کے سب سے پر جوش ترجمان تھے ان کی خاطر میرزا نے بقول خود "ردفرقہ وہابیہ"[1] میں ایک مثنوی لکھی تھی یہ مثنوی میرزا کے کلیات نظم میں[2] "مثنوی ششم بیان نموداری شان نبوت و ولایت کہ درحقیقت پرتو نورالانوار حضرت الوہیت است" کے عنوان سے شامل ہے۔

اس زمانے میں قتیل کے شاگرد غلام امام شہید حیدر آباد میں میلاد خوانی کی محفلیں گرم کئے ہوئے تھے، اور کئی امرا کے منجملہ نواب محی الدولہ بھی ان کی قدر افزائی کر رہے تھے، ابھی تک اس کا کچھ پتہ نہیں چل سکا کہ نواب محی الدولہ مرزا کی خط وکتابت کب اور کن حالات میں شروع ہوئی ممکن ہے کہ محی الدولہ سید صاحب عالم مارہروی کے معتقدین میں سے ہوں۔ حیدر آباد میں محی الدولہ ایک قدیم خاندان

---

[1] مکتوب[9] بنام ذکا   [2] کلیات نظم فارسی صفحہ ۱۰۲ نولکشور ۱۸۶۳ء

www.taemeernews.com

سے تعلق رکھتے تھے۔ حکمت خدمت صدارت واحتساب اس خاندان میں موروثی رہی ہے۔ ان کے جدِ اعلیٰ حکیم جعفر یار خاں محی الدولہ ثانی کے بھائی عبدالقادر المخاطب بہ قادر یار خاں حکیم الحکما محی الدولہ اول جو ایک جید عالم بھی تھے نواب صلابت جنگ کے عہد حکومت میں بندر سورت سے اورنگ آباد آئے اور پن چکی میں شاہ محمود کے تکیہ میں قیام کیا، یہ خاندان ایک عرصہ تک شاہی معالج بھی رہا۔ اس کے بعد کچھ عرصہ معتوب رہا۔ نواب ناصر الدولہ نے اپنے دور میں احمد یار خاں کو جاگیر بحال کی اور محی الدولہ حکیم الحکمأ رابع کا خطاب عطا کیا۔ احمد یار خاں کے چار بیٹے تھے ان میں تین سلسلہ طریقت میں نمایاں ہوئے جن میں حبیب علی شاہ مشائخین میں بہت ممتاز ہوئے۔ سب سے بڑے بیٹے محمد یار خاں حکیم الحکما محی الدولہ خامس خدمت احتساب بلدہ پر مامور ہوئے[1] یہ انتہا درجہ کے رحمدل غریب پرور شریف نواز، فیاض، اور سیر چشم تھے۔ ان کی سفارش سے ہزارہا آدمی نے پرورش پائی اور فکر معاش سے خلاصی حاصل کی، نواب افضل الدولہ کے دور میں ان کا انتقال ہوا۔ یہی وہ محی الدولہ ہیں جن کا ذکر مرزا غالب کے خطوط میں ملتا ہے اور جو غلام امام شہید کے قدرداں تھے۔

محی الدولہ کے خاندانی پس منظر اور ان کی خدمات

---

[1] غلام صمدانی گوہر تزک محبوبیہ جلد دوم دفتر اول ص ۱۷۱

www.taemeernews.com

صدارت العالیہ دہتساب سے ظاہر ہے کہ مذہبی معاملات میں ان کی دلچسپی لازمی تھی اور"فرقہ وہابیہ" سے ان کی نفرت فطری تھی۔

محی الدولہ کے ان معتقدات کے پیش نظر غالب نے اپنی وہ پہلودار مثنوی جس کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ ردفرقہ وہابیہ میں لکھی تھی، محی الدولہ کو بھیجی، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مثنوی کسی مذہبی جذبہ کے تحت بھیجی تھی۔ حقیقت واقعہ یہ ہے کہ ملک کے مختلف حصوں میں قتیل کی عقیدت مندی اور اس کے شاگردوں کی وجہ سے میرزا کو ساری عمر صدمے پہونچے، ایک طرف قتیل کے شاگردوں نے مرزا کے خلاف علمی معرکہ آرائی کی دوسری طرف ان کے معیار سخن نے عوام کے مذاق کو اس طرح متاثر کیا کہ اعلیٰ درجہ کے شعروادب کی پذیرائی سوسائٹی میں بہت مشکل ہوگئی۔ قتیل کے گروہ کا سب سے بڑا سہارا نعت گوئی تھا جس کا معیار یہ تھا کہ وہ امراء کے ہاں میلاد خوانی کی محفلیں گرم رکھتے، ایسے ماحول میں میرزا کی کہی ہوئی نعتوں، مثنویوں، قصائد اور دیگر کلام کی قدر مشکل تھی۔ اور میرزا کی علمی غیرت کا یہ حال تھا کہ جب کسی امیر کی بابت یہ سن لیتے وہ قتیل سے متاثر ہے تو پھر اس کے پاس اپنا کلام نہیں بھیجتے تھے۔

محی الدولہ قتیل کے گروہ سے تو نہیں تھے لیکن قتیل کا گروہ ان کے

www.taemeernews.com

یہاں بار پا رہا تھا، لہذا میرزا نے "فرقہ وہابیہ" کی مثنوی محی الدولہ کے یہاں دراصل رد گروہِ قتیل کی خاطر بھیجی۔ لیکن انہیں اس میں کامیابی نہیں ہوئی۔

"رد فرقہ وہابیہ میں ایک مثنوی جو سابق میں لکھی تھی وہ محی الدولہ کو بھیجی، رسید کبھی نہ آئی۔ اب سنتا ہوں کہ مولوی غلام امام شہید شاگرد قتیل وہاں کوس "انا ولا غیری" بجا رہے ہیں اور سخن شناسوں کو اپنا زور طبع دکھا رہے ہیں۔ ..... محی الدولہ سے اور کچھ نہیں کہتا مگر یہ کہ خدا سمجھے .... اب آپ اس خط کی رسید لکھئے اور اس میں غلام امام شہید کا حال مفصل لکھئے کہ ان کی وہاں کیا صورت ہے۔ ایک شخص مجھ سے یوں کہتا تھا کہ مختار الملک نے منہ نہ لگایا، مگر محی الدولہ نے چار سو روپے مہینہ سرکارِ جناب عالی سے مقرر کرا دیا ہے۔"[1]

(مرقومہ ۲۶ر اگست ۱۸۶۳ء)

ذکا کا ایک خط[2] غالباً اسی مکتوب کے جواب میں ہے جس میں میرزا کو وہ یا نعم المولا سے مخاطب کرتے ہیں۔ اسی خط میں وہ اشارۃً لکھتے ہیں کہ "فلاں شخص نے اس دیار میں شاعری اور اظہار شیخت پر کمر باندھی

---

[1] مکتوب[2] بنام ذکا۔ [2] خاش و خماش ص۹

www.taemeernews.com

ہے اور فلاں کے ساتھ جو خود عاشق رسول ہے رقابت کی نسبت پیدا کی
ہے ، اس بزرگوار نے مولود خوانی کی محفلوں کو جو رواج دیا ہے اور اسپر
اعوان و انصار جو وجد کر رہے ہیں اس کی وجہ سے تماشا پسند یہانتک
پہونچ گئے ہیں کہ شہر کے ثقات کو نخل وطن کے سوا چارہ نہیں ۔
آقائے ولی نعمی (مختار الملک) کی نوازشوں کی یہ کیفیت ہے
کہ مولوی موید الدین خاں[1] کو اس سارے تقرب اور ان کے عہدہ
کی جلالت کے باوجود صرف چار سو روپیہ ماہانہ دیتے ہیں اور فلاں
اسی قدر رقم ابلہ فریبی سے حاصل کر لیتے ہیں ۔ پیشگار ریاست میں
جناب وزارت مآب کی وکالت محی الدولہ کے اصرار پر ہوئی ہے جنہوں
نے احکام صادر کروانے تک دم نہیں لیا ۔"
اس خط میں ذکا نے کسی کا نام نہیں لکھا بلکہ صرف فلاں
اور اس بزرگوار کہکر گفتگو کی ہے ، یہ فلاں اور بزرگوار غلام امام شہید اور
راجہ گردھاری پرشاد باقی ہی ہو سکتے ہیں ۔ راجہ گردھاری پرشاد باقی
کایستھ قوم سے تعلق رکھتے تھے اور ان کے اجداد آصف جاہ اول
کے ساتھ دکن آئے تھے ۔ ریاست کے امرا میں ممتاز مقام حاصل تھا ۔

---

[1] ملاحظہ ہو صد۴۳ کتاب ہذا

www.taemeernews.com

خود شاعر تھے، حضرت شمس الدین فیضؔ سے تلمذ حاصل تھا۔ متعدد کتب کے مصنف ہیں[1] وقصائد اور نعت بھی کہتے تھے۔ ان کی ایک نعت جس کے اشعار یہ ہیں

ترا اول بہ اخفا آفریدند — ازاں پس دین و دنیا آفریدند
نہ شد از سرمۂ ما زاغ محتاج — کہ چشمانِ تو شہلا آفریدند

غلام امام شہید کے معمولات مولود میں داخل تھی اور وہ اکثر مجالس میلاد کا افتتاح اسی نعت سے کیا کرتے تھے[2]

حبیب اللہ ذکا کے بارے میں یہ جاننا دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا کہ اُن کے مذہبی عقائد کیا تھے، ذکا نائطی تھے اور اہل نوائط شافعی مسلک کے ہوتے ہیں۔ ان کی ہمدردیوں کا اہل حدیثوں سے وابستہ ہونا زیادہ قرینِ قیاس ہے۔ ذکا غلام امام شہید کو کئی وجوہات سے ناپسند کرتے ہیں ایک تو اس لئے کہ شہید کے عقائد ذکا کیلئے سخت ناگوار ہیں، دوسرے ذکاؔ نے فارسی مشہدی خانداں کے افراد غا ~~قب~~ اور بنیش سے سیکھی تھی اور پھر میرزا غالب کے زیر تربیت رہے غلام امام

---

[1] غلام صمدانی گوہر تزک محبوبیہ جلد دوم دفتر اول ص ۴۱۲، دفتر ہفتم ص ۲۹

[2] مرقع سخن مرتبہ ڈاکٹر زور ص ۱۵ مطبوعہ ادارہ ادبیات اردو ۱۹۳۵ء

www.taemeernews.com

شہید ان کی نظر میں کیا جچتے۔ ان سب سے بڑھ کر استاد غالب کی محبت ذکا کو شہید سے متنفر رکھنے کے لئے کافی تھی۔

میرزا غالب آخر زمانے تک ذکا سے شہید کے حالات معلوم کرتے رہے۔ ۱۱۔ جنوری ۱۸۶۷ء کو ایک خط لکھتے ہیں:

"ہاں صاحب اودھ اخبار میں ایک قصیدہ غلام امام کا دیکھا "مکان تنگ است" "جہاں تنگ است" مدح مختار الملک میں، متضمن استدعائے مسکنِ وسیع۔ پھر مہینہ بعد اسی اودھ اخبار میں یہ خبر دیکھی کہ نواب نے مسکن تو نہ دیا، مگر تیس روپے مہینہ بڑھا دیا۔ اسی اخبار میں پھر دیکھا کہ ایک مولوی صاحب نے غلام امام کے کلام پر اعتراض کیا ہے اور ان کے شاگرد وضیع تخلص نے اس کا جواب لکھا ہے، آپ سے اس روداد کی تفصیل اور جوابِ اعتراض و معترض کے نام کا طالب ہوں۔ بہ سبیل استعجال"[1]

یہ داستانیں بہت طولانی ہیں۔ یہاں ان اشارات سے یہ واضح کرنا مقصود تھا کہ، اس کے اغراض و مقاصد کچھ ہی کیوں نہ ہوں، میرزا حیدرآباد کی سیاست اور یہاں کے علمی و ادبی معیارات و ماحول سے کس قدر باخبر رہتے تھے اور ان امور کے بارے میں کس قدر متجسس

---

[1] مکتوب ۱۱

www.taemeernews.com

رہتے تھے۔ ذکا کی شخصیت، مطالعہ غالب میں اس لحاظ سے خاص طور پر اہم ہے کہ وہ حیدرآباد سے میرزا کے تعلقات میں ایک مرکزی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کی ضرورت ہے کہ ذکا کی زندگی کا علیٰحدہ طور پر تفصیلی مطالعہ کیا جائے۔

ذکا نے ۴۷ برس کی عمر پائی اور ۱۸۷۵ء میں بعارضہ فالج انتقال کیا۔ حیدرآباد کے محلہ چنچل گوڑہ میں مدفون ہیں[1]

قربان علی سالک

قربان علی بیگ خاں سالک غالب کے دوسرے اہم اور عزیز حیدرآبادی شاگرد ہیں۔ مولانا غلام رسول مہر نے سالک اور ان کے بھائی میرزا شمشاد علی بیگ رضوان کا ذکر خاندان لوہارو کے تذکرہ میں دیا ہے، اس کے ساتھ یہ نوٹ بھی دیا ہے:

"مالک رام صاحب فرماتے ہیں کہ سالک و رضوان کو خاندان لوہارو سے کوئی تعلق نہیں تھا۔"

اصل وجہ یہ ہے کہ سالک کے اجداد کا حال کسی تذکرے میں نہیں ملتا۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، بانی جماعت اسلامی، قربان علی بیگ خاں

---

[1] مالک رام، تلامذہ غالب، پہلا ایڈیشن

www.taemeernews.com

سالک کے حقیقی نواسے ہیں، انہوں نے اپنی ایک سوانحی یادداشت میں اپنے ننہیال کا جو ذکر کیا ہے اس سے سالک کے اجداد کے بارے میں کافی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ لہذا ہم یہاں مولانا مودودی کا بیان نقل کرتے ہیں :

"ننہیال کی طرف سے میں ترکی الاصل ہوں، میرے نانا مرزا قربان علی بیگ خاں سالک گو خود شاعر اور صاحب قلم تھے مگر پشت ہا پشت سے ان کا پیشہ آبا سپہ گری تھا، ان کے بزرگوں سے میرزا طولک بے عالمگیر کے عہد میں ماوراءالنہر سے ہندوستان آئے اور فوجی مناصب سے سرفراز ہوئے۔ شاہ عالم کے زمانے تک اس خاندان کے لوگ کسی نہ کسی طرح شاہی خدمت بجا لاتے رہے۔ جب شیرازہ سلطنت درہم برہم ہوا تو مختلف افراد مختلف سمتوں میں تتر بتر ہو گئے۔ چنانچہ حضرت سالک مرحوم کے والد نواب عالم بیگ خاں اور چچا نواب نیاز بہادر، نواب میر نظام علی خاں کے آخری عہد میں حیدرآباد آئے۔ نیاز بہادر خاں کی شادی نواب مستقل جنگ عزت الدولہ عاشور بیگ خاں کی صاحبزادی سے ہوئی یہ عاشور بیگ خاں ان کے ہم جد رشتے میں ان کے چچا تھے۔

www.taemeernews.com

اور دولت آصفیہ نے اسی اعزاز و خطاب سے سرفراز کیا تھا جو خطاب و اعزاز دولت مغلیہ کی جانب سے ان کے جد کو عطا کیا گیا تھا۔ نواب مستقل جنگ کے بعد نواب نیاز بہادر خاں ان کی جگہ نظم جمعیت کے جمعدار اور جاگیر کے مالک ہوئے۔

عالم بیگ خاں کی شادی عبدالرحیم خان قلعہ دار گولکنڈہ کے خاندان میں ہوئی اور انہی بیوی کے بطن سے حضرت سالک مرحوم پیدا ہوئے۔

۱۸۲۲ء میں نواب نیاز بہادر خاں چنچل گوڑہ کے ہنگامہ میں شہید ہوئے۔ اس واقعہ کے بعد نواب عالم بیگ خاں اپنے خورد سال بچے کو لیکر دہلی واپس چلے گئے۔ اس کے تقریباً چالیس سال بعد میرزا سالک پھر حیدرآباد واپس آئے۔ اور سر سالار جنگ اعظم نے ان کو سررشتہ تعلیمات میں مامور کر دیا۔ یہاں انہوں نے نواب عماد الملک بلگرامی کی سرپرستی اور شرکت سے مخزن الفوائد کے نام سے ایک رسالہ بھی جاری کیا تھا۔ جو اگرچہ حیدرآباد کا پہلا پرچہ نہیں تو کم از کم قدیم ترین علمی و ادبی رسالوں میں سے ایک ضرور تھا۔ ۱۸۵۴ء[1] میں حضرت سالک نے انتقال فرمایا

---

[1] یہ تاریخ وفات صحیح نہیں ہے۔ سالک کا انتقال ۱۸۸۱ء میں ہوا۔ قدر بلگرامی نے یہ تاریخ کہی ہے : نواب قربان علی سالک ہزار افسوس مرد

www.taemeernews.com

اور اسی خاک میں دفن ہوئے جہاں پیدا ہوئے تھے "۔ [1]

جیسا کہ مولانا مودودی کے بیان سے ظاہر ہے سالک کم عمری ہی میں اپنے والد کے ساتھ دہلی چلے گئے تھے "سالک نے پندرہ برس کی عمر میں شعر کہنا شروع کیا۔ آغاز میں تھوڑے دن حکیم مومن خان کو اپنا کلام دکھایا لیکن جلد ہی انہیں چھوڑ کر غالب سے مشورہ کرنے لگے، ابتدائے مشق میں اپنے نام کی رعایت سے تخلص بھی قربان کرتے رہے لیکن غالب نے اسے بدل کر سالک کر دیا۔" [2] سالک ۱۸۳۰ء کے لگ بھگ دہلی پہونچے ہیں اور ۱۸۴۰ء کے لگ بھگ انہوں نے حکیم مومن خان کو اپنا کلام دکھایا ہے۔ اس کے بعد میرزا غالب کو کلام دکھانے لگے۔ غالب کے انتقال تک سالک کسی قابل لحاظ مدت تک قیام کے لئے حیدرآباد نہیں آئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کا قیام بیشتر دہلی ہی میں رہا۔ اگرچہ وہ درمیان میں کچھ عرصہ الور میں بھی رہے۔ رامپور، سہارن پور اور دوسرے مقامات کا سفر بھی کیا اس طرح میرزا غالب سے سالک کی وابستگی کی مدت انتیس، تیس برس کے لگ بھگ ہے۔

---

[1] مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، 'کچھ اپنے بارے میں'۔ ماہنامہ افق' حیدرآباد اگست ۱۹۶۴ء

[2] مالک رام تلامذہ غالب صفحہ ۱۴۳ پہلا ایڈیشن۔

www.taemeernews.com

غالب کے شاگردوں میں بہت کم ایسے ہیں جن کو اتنی مدت تک میرزا کی خدمت میں حاضری کا شرف حاصل رہا ہو۔

سالک وسیع المشرب اور صلح کل مزاج کے معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے دیوان سے اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ حیدرآباد، دہلی، رامپور، الور، سہارنپور، جھجر اور کن کن مقامات پر امیروں، ادیبوں اور عالموں میں سالک کے احباب موجود تھے اور سالک کو ان سے کیسا ربط و علاقہ تھا۔

سالک کے کہے ہوئے قطعات تاریخ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ۱۸۷۰ء کے قریب حیدرآباد واپس آگئے تھے، حیدرآباد واپس ہونے کے بعد عماد الملک سید حسین بلگرامی کی سرپرستی میں رسالہ مخزن الفوائد جاری کیا۔ ان رسالوں میں سالک نے جو مضامین لکھے ہیں ان میں وہ مضمون بہت اہم ہے جو انہوں نے اردو زبان کی تاریخ سے متعلق لکھا ہے۔ اردو لسانیاتی ادب کی تاریخ میں بالعموم اس مضمون کا ذکر چھوٹ گیا ہے۔ میرزا غالب سے سالک کی خط و کتابت بہت کم رہی ہے۔ میرزا کے صرف دو خطوط سالک کے نام دستیاب ہو سکے ہیں جو ان اوراق میں شامل ہیں[1]۔ سالک کے

---

[1] ملاحظہ ہو باب سخن ہائے گفتنی

www.taemeernews.com

نام میرزا کے خطوط کے کم ہونے کا سبب یہ ہے کہ سالک زیادہ تر اُن کی خدمت میں حاضر رہے اور خط و کتابت کی ضرورت ہی نہیں پڑی لیکن ان کے نام میرزا کے یہ دو خط میرزا کے سارے مکتوبات کی نسبت زیادہ نمایاں خصوصیات کے حامل ہیں۔ ان خطوط میں میرزا نے سالک سے جو انداز خطاب اختیار کیا ہے اور اپنی نجی زندگی کو جس طرح بیان کیا ہے اس سے اُستاد و شاگرد کے گہرے تعلقات پر روشنی پڑتی ہے۔

سالک غالب کے ان شاگردوں میں ہیں جنھیں یہ فخر حاصل ہے کہ "غالب کی وفات کے بعد ان کے بیشتر مبتدی اور کم مشق شاگردوں نے ان سے اصلاح لی"[1]

سالک جب حیدرآباد آئے ہیں تو دبستان غالب کا ایک اہم دروازہ انہی کی وجہ سے یہاں کھلا۔ سالک ایک قادر الکلام شاعر تھے۔ ان کی نثر شگفتگی اور سلاست کی آئینہ دار ہے ان کے دو مجموعہ ہائے کلام "ہنجار سالک اور میخانہ سالک" شائع ہوئے۔ یہ دونوں مجموعے اگرچہ نایاب ہو چکے ہیں لیکن ان کے بیٹے محمد مرزا خلال عابد

---

[1] مالک رام تلامذہ غالب ص ۱۴۱ پہلا ایڈیشن

www.taemeernews.com

نے ۱۸۸۰ء میں ان کا کلیات چھاپا جو ہمارے پیش نظر ہے۔
کلیاتِ سالک کی حیثیت بلحاظ معیار شاعری جو بھی ہے اس سے
قطع نظر اسے غالبیات کے اہم ماخذ کا بھی مقام حاصل ہے۔ اس
میں جو قطعاتِ تاریخ دیئے گئے ہیں وہ میرزا غالب کے رشتہ داروں
شاگردوں، دوستوں اور معاصرین سے متعلق ہیں۔ ان قطعات
کے مطالعہ سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ سالک کے تعلقات ان
سب سے نہایت خوشگوار تھے اور وہ میرزا غالب سے بعض لوگوں
کی کشاکش سے بالکل دور تھے۔ سالک کا انتقال ۵۷ برس کی
عمر میں ۱۸۸۱ء میں حیدرآباد میں ہوا۔ اور وہ تاڑبن کے قبرستان
میں مدفون ہوئے۔ میرزا غالب نے آخر زمانہ میں سید مقبول عالم
کو ایک خط لکھا تھا کہ انہوں نے ایک شعر بہت دنوں سے کہہ
رکھا ہے اور وہ شعر یہ ہے:

رشکِ عرفی و فخرِ طالب مُرد　　اسد اللہ خاں غالب مُرد

میرزا کی یہ آرزو تھی کہ ان کے بعد ان کا کوئی دوست ان کا مصرعہ
لکھے اور اس شعر کو بند قرار دے کر ترکیب بند رقم کرے۔ چنانچہ انہوں
نے سید مقبول عالم کو وصیت کی تھی کہ وہ کاغذ اپنے پاس رکھیں اور
وقت پر ترکیب بند لکھیں۔ پتہ نہیں کہ سید مقبول عالم یہ خواہش پوری

www.taemeernews.com

کر سکے یا نہیں کر سکے لیکن قربان علی سالک نے چھ بند پر مشتمل ایک ترجیع بند لکھ کر میرزا کی یہ خواہش پوری کر دی۔ اور اس میں بند کا شعر یہی رکھا۔ میرزا کے تمام مرثیوں میں سالک کا مرثیہ سب سے زیادہ پر تاثیر سمجھا جاتا ہے۔ اس کے آخری چند شعر یہاں نقل کیے جاتے ہیں:

کیجیے نالہ اور مر رہیے　　زندگی کی ہے کائنات یہی
کیا کہوں کون مر گیا سالک　　آپ کہتے ہیں طالب و عرفی

رشکِ عرفی و فخرِ طالب مُرد
اسد اللہ خاں غالب مُرد

میاں داد خاں سیّاح

مطالعہ غالب میں اورنگ آباد کو حیدرآباد سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ غالب کے زمانہ میں اورنگ آباد، ریاست حیدرآباد کا ایک جز تھا، قیاس کیا جاتا ہے کہ میاں داد خاں سیاح ۱۸۲۲ء کے لگ بھگ اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔ سیاح کی ابتدائی زندگی عیش و آرام میں گذری، لیکن جب وہ سنِ شعور کو پہنچے تو فکرِ روزگار میں مبتلا ہو گئے، پندرہ سولہ برس کی عمر میں اپنے وطن کو چھوڑ سورت پہنچے۔ سورت اُس زمانے میں علم و ادب کا اچھا خاصا مرکز تھا۔ سیاح نے ابتدائی

www.taemeernews.com

تعلیم تو اورنگ آباد ہی میں حاصل کی لیکن ان کا ذوق ادب سورت میں پروان چڑھا۔[1] سیاح خوش فکر، یار باش اور زندہ دل آدمی تھے، خوش لباس ایسے کہ کپڑے دہلی میں سلواتے تھے۔ عطر کا شوق اس درجہ کہ جس گلی کوچہ سے نکل جاتے وہ مہک اٹھتا اور لوگ محض فضا کی خوشبو سے کہہ دیتے کہ سیاح اس طرف سے گذرے ہیں۔[2] سیاح نے ۱۸۶۲ء میں نواب میر غلام بابا خاں سی۔ آئی۔ ای رئیس سورت کی مصاحبت اختیار کر لی، نواب صاحب کی زندگی بھر تو یہ بہت عافیت سے رہے لیکن جب ۱۸۹۳ء میں ان کا انتقال ہو گیا تو ان کا ستارہ بھی گردش میں آگیا۔ اس کے بعد کے دس بارہ برس بہت تنگی کی حالت میں بسر کیے۔ ان ایام میں ان کے ایک دوست اور مداح حکیم شیخ محمد (یا محمود) میاں صاحب نے دستگیری کی اور اُن کے کفیل رہے۔[3]

سیاح کو سیر و سیاحت سے بڑی دلچسپی تھی۔ انہوں نے عرب و عجم میں بہت سے سفر کیے۔[4]

---

[1] ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی، میاں داد خاں سیاح، سب رس کتاب گھر ۱۹۵۷ء

[2] مالک رام، تلامذہ غالب ص ۱۵۵ پہلا ایڈیشن۔

[3] ایضاً

www.taemeernews.com

ان کا ایک سفر ۱۸۴۶ء میں شروع ہوتا ہے۔ جب وہ دکن، بنگال، دہلی، پنجاب، سندھ، کابل، کشمیر اور قندہار کا سفر کرتے ہوئے ۱۸۶۰ء میں لکھنؤ اور پھر ۱۸۶۱ء میں کلکتہ جاتے ہیں اور ۱۸۶۲ء میں سورت واپس آتے ہیں۔ اسی سیاحت کے دوران میں سیاح کی ملاقات میرزا غالب سے ہوتی ہے۔ ۱۸۶۶ء میں سیاح اپنے عزیزوں سے ملنے کے لیے اورنگ آباد جاتے ہیں۔ ۱۸۷۱ء میں پھر طویل سفر پر روانہ ہوتے ہیں۔ اس سفر میں کانپور، لکھنؤ، آگرہ میں کچھ دن گذار کر سورت واپس ہوتے ہیں۔ ۱۸۷۳ء میں بمبئی اور پونا جاتے ہیں۔

۱۸۷۴ء میں دوبارہ بمبئی، پونا، پنچ گنی، کنڑپہ اور مدراس کی سیر کرتے ہیں۔ ۱۸۷۵ء میں دکن کے علاقوں کی سیر کرتے ہیں۔ اسی سال مارچ کے مہینے میں حیدرآباد قیام کرتے ہیں لیکن ڈسمبر میں الہ آباد، عظیم آباد اور کلکتہ میں دکھائی دیتے ہیں۔ ۱۸۸۰ء میں حیدرآباد آتے ہیں لیکن یہاں قلب سازی کے الزام میں حکومت برطانیہ کی طرف سے گرفتار کیے جاتے ہیں اور ۴ سال کی سزائے قید پاتے ہیں۔

لیکن ۱۸۸۷ء میں ملکہ وکٹوریہ کی سلور جوبلی پر قصیدہ لکھنے کے صلہ میں قید کی مدت میں تخفیف کر دی جاتی ہے اور قبل از وقت رہا کر دیئے

www.taemeernews.com

جلتے ہیں[1]۔

سیاح اور میرزا غالب کے تعلقات بہت اہم ہیں۔ سیاح شروع میں عشاق تخلص کرتے تھے۔ جب غالب کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے اسے بدل کر سیاح کر دیا[2]۔

میرزا غالب اور سیاح کے درمیان خط و کتابت کا سلسلہ ۱۸۶۰ء سے شروع ہو چکا تھا۔ جو ۱۸۶۸ء تک جاری رہا۔ سیاح کے نام مرزا غالب کے پینتیس خطوط ہم تک پہونچے ہیں۔ سیاح اور غالب کے تعلقات میں سب سے اہم واقعہ لطائف غیبی کا ہے۔ ۱۸۶۲ء میں جب مرزا غالب نے قاطع برہان شائع کی تو ہندوستان کے فارسی دانوں کے حلقوں میں گویا بھونچال آ گیا "اس کتاب کا جواب سب سے پہلے سید سعادت علی نے "محرق قاطع برہان" چھاپ کر دیا۔ "محرق قاطع برہان" ۱۸۶۴ء میں چھپی۔ اس کتاب کے جواب میں میرزا کی طرف سے ۱۸۶۵ء میں جو کتاب شائع کی گئی اُس کا نام لطائف غیبی تھا۔ اس کتاب کا مصنف میاں دادخاں

---

[1] ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی "میاں دادخاں سیاح"

[2] مالک رام "تلامذہ غالب" ص ۱۵۶ بار اول

www.taemeernews.com

سیاح ظاہر کیا گیا تھا۔ چنانچہ کتاب کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے۔

"سیاح بحر و بر، ہیچمداں، بے ہنر، سیف الحق، میاں داد خاں،
حق شناسوں کی خدمت میں عرض کرتا ہے۔۔۔۔"

یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ اس کتاب کے اصل مصنف خود میرزا غالب تھے۔ اور مصلحتاً انہوں نے اسے میاں داد خاں سیاح کی جانب سے شائع کیا۔ یہ گویا سیاح اور میرزا کے درمیان ایک طرح کا سمجھوتہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ میرزا نے میاں داد خاں سیاح کو "سیف الحق" کا خطاب دیا تھا۔ اپنے ایک خط میں میرزا سیاح کو لکھتے ہیں۔

"تمہیں میں نے جو سیف الحق کا خطاب دیا ہے اپنی فوج کا
سپہ سالار مقرر کیا ہے۔ تم میرے ہاتھ ہو، تم میرے بازو ہو،
میرے نطق کی تلوار تمہارے ہاتھ سے چلتی رہے گی۔
لطائف غیبی نے اعدا کی دھجیاں اڑا دیں۔"[1]

اسی زمانہ میں میرزا نے قتیل کے کلام پر ایک سخت تنقیدی مضمون لکھا اور اشرف الاخبار میں چھپوایا۔ یہ مضمون بھی سیاح کے نام سے

---

[1] اردوئے معلی صـ۱۲۳، مطبع مجتبائی ۱۸۹۹

www.taemeernews.com

شائع کیا اور میرزا نے سیاح کو اس طرح اطلاع دی :

"ایک لفافہ تم کو بھیجتا ہوں۔ اس کو پڑھ کر معلوم کر لو گے کہ تمہارا ایک اعتراض قتیل کے کلام پر چھاپا گیا ہے، اس ارسال اور اعلام سے صرف اطلاع منظور ہے"[1]

غرض سیاح اس تمام تر معرکہ میں میرزا کے نطق کی تلوار بنے رہے، سیاح کے نام میرزا کے جو خطوط ہیں ان سے نہ صرف اس معرکہ پر روشنی پڑتی ہے بلکہ میرزا کی سوانح کے بارے میں اہم معلومات حاصل ہوتی ہیں۔

سیاح نے تقریباً پچاسی برس کی عمر پائی اور ۱۹۰۷ء میں سورت میں انتقال کیا۔ وہیں محلہ "بڑے خاں کا چکلہ" میں خواجہ دیوانہ صاحب (خواجہ سید جمال الدین) کی خانقاہ میں مدفون ہیں[2]

---

[1] اردوئے معلیٰ ص۱۲۰، مطبع مجتبائی، ۱۸۹۹ء

[2] ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی، میاں داد خاں سیاح،

www.taemeernews.com

سخنہائے گفتنی

میرزا غالب کے خطوط، عرضداشتیں
اور قصیدے جو انھوں نے اہلِ
حیدرآباد کو لکھے تھے

بیا و رید گر این جا بود زبان دانے
غریبِ شہر سخن ہائے گفتنی دارد

بنام حبیب اللہ ذکا

(۱)

صبح سہ شنبہ ۱۳ ۔ صفر سال غفر (۱۲۸۰ھ) صاحب، میں تم کو اخوان الصفا میں گنتا ہوں ۔ اپنا نورِ نظر و لختِ جگر جانتا ہوں ۔ دیکھو تم پر مجھ کو کیا اعتماد ہے کہ خود ضبطِ راز نہیں کر سکتا اور تم سے رازداری اور امانت میں استواری چاہتا ہوں ۱۲

قصیدہ و غزل میں صلہ و تحسین بہ اقتضاءِ بخت و قسمت ہے نہ باندازہ

www.taemeernews.com

ارزش کلام ۱۲ ممدوح سخن فہم ہوتا تو مجھ کو متوسط کے تساہل کا وہم ہوتا۔ اغنیاء کو نہ مذاق شعر سے نسبت نہ مطالعہ اشعار کی فرصت۔ متوسط نے بقدر (ہمت ؟) سلسلہ جنبانی کی، لیکن مرجع نے نہ قدردانی کی ۱۲

مولوی غلام غوث خاں بیخبر میر منشی لفٹنٹ گورنر مخلص خاص الاخلاص ہیں، ہرگز ان کو مدعی سے تلمذ نہیں۔ البتہ اس کو خوشگوار جانتے ہیں اور یہ کبھی نہ ہوگا کہ وہ میرا مقابلہ کریں اور "قاطع برہان" کا جواب لکھیں:

باطل است آنچہ مدعی گوید

مدعی اپنے زعم میں مجھ کو اپنا ہم فن جان کر حسد کرتا ہے میں امیر علی شیر[1] جیسا محتسب اور مولوی جامی[2] جیسا مفتی کہاں سے لاؤں جو نیا ذکر کرے اور کاذب کو سزا دے؟ شکر ہے خدا کا کہ تم سخنور اور سخندان ہو اور یقین ہے کہ قلمرو ہند میں اور بھی ایسے آدمی ہوں گے کہ میرے اور مدعی کے رتبے کو تمیز ہو سکیں گے:

---

[1] نظام الدین علی شیر نوائی فرمانروائے چغتائیہ ہرات سلطان حسین میرزا کا ہم مکتب تھا جب سلطان حسین میرزا تخت پر بیٹھا تو اسے مصاحبی میں لے لیا۔ اس کی سرپرستی میں ہرات علم و ہنر کا مرکز خاص بن گیا۔ خود ترکی اور فارسی کا خوش ذوق شاعر تھا۔ دونوں زبانوں میں دیوان موجود ہیں۔ مجالس النفائس کے نام سے شعراء کا تذکرہ بھی لکھا تھا جو چھپ گیا ہے مولانا جامی سے بڑی عقیدت تھی۔

[2] مولانا عبدالرحمن جامی جن کا درجہ بلند علم و شعر و تصوف میں کسی شرح کا محتاج نہیں (مولانا مہر)

www.taemeernews.com

عید است بادہ شد فلک و ساغر آفتاب

خالصاً لِلّٰہ، فلک ظرف اور آفتاب مظروف ہے، یہ شخص ظرف کو مظروف اور مظروف کو ظرف ٹھہراتا ہے۔ اس کو کون مسلم رکھے گا؟ اس سے بڑھ کر ایک اور خدشہ ہے، یعنی مشبہ اور مشبہ بہ میں وجہ شبہ شرط ہے۔ آفتاب و ساغر میں تدویر وجہ شبہ ہے، شراب اور فلک میں وجہ شبہ کہاں؟ ۱۲

میں اپنے کو ایسا نہیں جانتا کہ تمہارے کلام کو اصلاح دوں۔ قدردانی کیونکر کہوں، قدر افزائی کرتے ہو۔ دوستانہ، نہ استادانہ، جو خیال میں آئے گا کہا جائے گا۔ اگر آپ نے اس روش کا یعنی استصلاح کا التزام کیا ہے تو جب تک کاغذ اشعار میرے پاس سے واپس نہ جایا کرے۔ ما کُتِبَ فیہ شہرت نہ پایا کرے۔ مجموعۂ کلام سابق بھیج دو گے، میں بکمال طیب خاطر اس کو دیکھ کر بھیج دوں گا۔

استجازت کیا ضرور ؟ ۱۲ نجات کا طالب، غالب

۱۳۔ صفر ۱۲۸۰ھ مطابق ۳۰۔ جولائی ۱۸۶۳ء)

(۲)

حضرت مولوی صاحب،

میں برس دن سے بیمار اور تین مہینے سے صاحب فراش ہوں۔ اٹھنے بیٹھنے کی طاقت مفقود۔ پھوڑوں سے بدن لالہ زار۔ پوست

www.taemeernews.com

سے ہڈیاں نمودار۔ کھوڑے ایسے جیسے انگارے سلگتے ہیں۔ اعضاء پر دس جگہ پھاڑے لگتے ہیں۔ ضعف و ناتوانی علاوہ، سوزغم ہائے نہانی علاوہ۔ صنعت سہل ممتنع میں، میں نے نواب مختار الملک کو قصیدہ[1] بھیجا، کچھ قدردانی نہ فرمائی۔

ردِّ فرقہ وہابیہ میں ایک مثنوی[2] جو سابق میں لکھی تھی، وہ محی الدولہ کو بھیجی، رسید بھی نہ آئی۔ اب سنتا ہوں کہ مولوی غلام امام شہید شاگرد قتیل وہاں کوس "انا دلا غیری" بجا رہے ہیں اور سخن ناشناسوں کو اپنا زور طبع دکھا رہے ہیں۔ ایک کم ستر برس کی عمر میری ہوئی۔ سوائے شہرت خشک کے فن کا کچھ پھل نہ پایا۔ "احسنت" و "مرحبا" کا شور سامعہ فرسا ہوا۔ خیر، ستائش کا حق ستائش سے ادا ہوا۔ مختار الملک نے یہ بھی نہ کیا، نہ مدح کی داد دی، نہ مدح کا صلہ دیا۔ حیران ہوں کہ نواب صاحب مجھے کیا سمجھے۔ محی الدولہ سے اور کچھ نہیں کہتا،

---

[1] یہ قصیدہ اس کتاب کے باب سخنہائے گفتنی میں درج ہے۔ اس کی تفصیلی روداد باب "تماشائے اہل کرم" میں دی گئی ہے۔

[2] اس مثنوی کے بارے میں تفصیلی بحث اس کتاب کے باب "ادبی تعلقات" میں دی گئی ہے۔ محی الدولہ کو غالب نے جو مثنوی بھیجی تھی اس کا پس منظر کیا تھا، اور اس کا انجام کیا تھا، اور اس کا انجام کیا ہوا، اس پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

www.taemeernews.com

مگر یہ کہ خدا سمجھے۔ ۱۲

کل سے پلنگ پر لیٹا لیٹا غزل کو دیکھ رہا ہوں اور لیٹے لیٹے یہ سطریں لکھتا ہوں :

دیدیم گل ز لالہ چہار رنگ بر آورد

فقیر کے نزدیک دیدیم زائد ہے، اگر یوں ہو تو بہتر ہے :

ہر یک ز گل و لالہ[1] الخ

باشد شفقے کاں بلب لعل تو ماند گر چرخ بکام دل ما رنگ بر آورد

"باشد مخل معنی ہے۔ اگر اس کی جگہ" آرد" ہو تو بہتر مگر" آرد" صیغہ مستقبل کا اور" آورد" ماضی کا اور فاعل دونوں فعلوں کا چرخ۔ ہر چند اساتذہ نے یوں بھی لکھا ہے، مگر فارسی گویان ہند نہ مانیں گے۔ پس اس شعر کو یوں لکھنا چاہیے :

حاشا کہ شفق مثل لب لعل تو باشد کے چرخ بکام دل ما رنگ بر آورد

مصرع : خون شد دل غم دیدہ[2] الخ

یہ شعر ہموار ہے۔ نہ صاد کے قابل نہ اصلاح کا محتاج۔ چوتھا اور پانچواں

---

[1] پورا شعر یہ ہے :

ہر یک ز گل و لالہ چہار رنگ بر آورد رخسار تو زیں ہر دو جدا رنگ بر آورد

[2] خوں شد دل غم دیدہ ما دیدہ فرو ریخت دیدی کہ جفایت چہ بلا رنگ بر آورد
(مولانا مہر)

www.taemeernews.com

یہ دو شعر واہ کیا کہنا ہے:[1]

اے اہل ورع[2] الخ یہ بھی ہموار ہے۔ نہ صاد چاہتا ہے نہ اصلاح:

گوئی کہ زباں در دہنم برگ حنا بود   تا بوسہ زدم آں کفِ پا رنگ برآورد

مولوی صاحب یہ بات تو کچھ نہیں۔ زبان چاٹنے کا آلہ ہے، نہ چومنے کا۔

زبان برگِ حنا بن گئی تو بوسہ سے کف پا کیوں حنائی ہو جائے؟:

گوئی دہنم لب زرگ برگ حنا داشت

تا بوسہ زدم آں کفِ پا رنگ برآورد[3]

مقطع اور اس کے اوپر کا شعر دونوں اچھے۔ اب آپ اس خط کی رسید لکھئے اور اس میں غلام امام شہید کا حال مفصل لکھئے کہ ان کی وہاں کیا صورت ہے۔ ایک شخص مجھ سے یوں کہتا تھا کہ مختار الملک نے منہ نہ لگایا مگر محی الدولہ نے چار سو روپے مہینہ سرکار جناب عالی سے مقرر کرا دیا ہے۔

---

[1] چوتھا اور پانچواں شعر یہ ہیں:

تا بندگ ثیم ہر انگشت حنائی است   از عکس تنت بسکہ حنا رنگ برآورد

خوں کرد جگر حسرت اظہار تمنا   لب بستی من ہم چو حنا رنگ برآورد

[2] اے اہل ورع چوں نتواں داشت عزیزش   مے سرخ تر از خوں شما رنگ برآورد

[3] ذکا نے اپنا کلام مرتب کرتے وقت یہ شعر مقطع نیز دو اور شعر حذف کر دیے تھے (مولا مہر)

www.taemeernews.com

روز چہار شنبہ۔ ۱۰۔ ربیع الاول سنہ ۱۲۸۰ھ[1] مطابق ۲۶۔ اگست سنہ ۱۸۶۳ء

(۳)

مولانا،

ایک تفقد نامہ پہلے بھیجا تھا۔ اس کے جواب میں یہاں سے خط جواب طلب لکھا گیا تھا پھر ایک اور مہربانی نامہ آیا۔ اس میں میں نے اپنے خط کا جواب نہ پایا۔ ناچار اس خط کے جواب کی نگارش اپنے خط جواب طلب کے پاسخ آنے پر موقوف اور ہمت آزادانہ، نہ فطرت کیا دانہ اس تحریر کے پانے پر مصروف رکھی گئی۔ بارے وہ کل نظر افروز ہوا اور طبیعت اس کے مشاہدہ سے طرب اندوز ہوئی۔ اب درنگ وزری کی تقصیر معاف کیجیے اور اپنی دونوں نگارشوں کا جواب لیجیے۔

صاحب، تاریخ انطباع کلیات خوب لکھی ہے[2]۔ مگر ہزار حیف

---

[1] مطبوعہ نسخوں میں سنہ ۱۲۶۹ھ چھپا ہوا ہے، جو غلط ہے۔ صحیح سنہ ۱۲۸۰ھ ہے (مولانا مہر)

[2] اس سے مراد غالباً یہ قطعہ ہے:

غالب کہ نغز مطلق اگر معنی کم است — گویم کہ ہمسرش بہ سخن کمتر آمدہ
دیوان او ز مطبع منشی نولکشور — طور مار سعی کارگزاراں بر آمدہ
تاریخ انطباع نویسد ز کاسہ — جان سخن بہ قالب طبع اندر آمدہ
صدہا سے ادرشک برآمد ز منکراں — یک حرف ہا چہ شد ہمہ زانہ گر آمدہ
(خاش و خماش) ص ۲۰۶

www.taemeernews.com

کہ بعد از انطباع پہنچی۔ کتاب کی رونق افزا نہ ہوئی۔ بندہ پرور، تم چراغ دودمان مہر و وفا اور منجملہ اخوان الصفا ہو، مجھ سے تمہیں محبت روحانی ہے گویا یہ جملہ تمہاری زبانی ہے۔ دوست کی بھلائی کے طالب ہو، اس شیوے میں شریک غالب ہو۔ ایک خواہش میری قبول ہو، تاکہ مجھ کو راحت حصول ہو۔ مبادی کا ذکر نہیں کرتا ہوں۔ واقعہ حال دل نشین کرتا ہوں۔ جناب مولوی مؤید الدین خاں صاحب کے بزرگواروں میں اور فقیر کے بزرگوں میں باہم وہ خلّت و صفوت مرعی تھی کہ وہ مقتضی اس کی ہوئی کہ ہم اور ان میں برادرانہ ارتباط و اختلاط باہم رہے اور ہمیشہ یونہی بلکہ روز افزوں رہے گا۔ خط میں خط ملفوف کرنا جانب حکام سے ممنوع ہے۔ اگر یوں نہ ہوتا تو میں ان کے نام کا خط تمہارے خط میں ملفوف کر کے بھیجتا۔ ناچار اب آپ سے یہ چاہتا ہوں کہ آپ مولوی صاحب سے ملیں اور ان کو یہ خط اپنے نام کا دکھائیں اور میری طرف سے بعد سلام میرے کلیات کے پارسل کا ان کے پاس اور ان کے ذریعۂ عنایت سے اس مجلد کا حضرت فلک رفعت نواب مختار الملک بہادر کی نظر سے گزرنا اور جو کچھ اسکے گزرنے کے بعد واقع ہو، دریافت کر کے مجھ کو مطلع فرمائیں۔

جمعہ ۱۰۔ ربیع الثانی سنہ ۱۲۸۰ھ مطابق ۲۵۔ ستمبر سنہ ۱۸۶۳ء

غالب

www.taemeernews.com

(۴)

بندہ پرور،

آج تمہارا عنایت نامہ آیا اور آج ہی میں نے جواب ڈاک میں اور اس خط کے ساتھ پارسل کلیات کا بھی ارسال کیا۔ دسویں بارھویں دن خط اور مہینے بیس دن میں پارسل پہنچے گا۔ خط کا جواب ضروری الارسال نہیں، لیکن پارسل کی رسید ضرور لکھیے گا۔ آپ کے خط کی عبارت تو میں سمجھا، لیکن مدعا مجھ پر نہ کھلا۔ میں نے پارسل کب آپ کے پاس بھیجا اور کب آپ کو لکھا آپ یہ پارسل مؤیدالدین خاں کو دے دیجیے گا؟ پارسل کا لفافہ مولوی صاحب کے نام کا اور آپ کو اس کے ارسال کی اطلاع اور آپ سے یہ خواہش کہ مؤیدالدین خاں صاحب سے ملیے اور میرا خط جو آپ کے نام کا ہے انہیں دکھایئے اور ان سے پارسل کا حال دریافت فرمایئے۔ آپ لایتی بھی نہیں جو میں یہ تصور کروں کہ اردو عبارت سے استنباط مطلب اچھی طرح نہ کر سکے۔ بہرحال اب مدعا سمجھ لیجیے اور مولوی صاحب سے ملنے کا ارادہ فرمایئے اور پارسل کا حال معلوم کر کے لکھیے۔

۵ جمادی الاول ۱۲۸۰ھ دنوزدہم اکتوبر ۱۸۶۳ء

دادکا طالب، غالب

روز ورود نامہ نامی

www.taemeernews.com

(۵)

صاحب،

پہلے مطلع میں لطف نہیں، ہاں مضمون لطیف ہے، وہ فرد میں خوب آ گیا ہے۔ مطلع ثانی بسبب تعقیدات کے مہمل رہ گیا۔ "ورنہ" کا قافیہ اور شعر میں اور طرح سے بندھ گیا ہے۔ تیسرا شعر الفاظ بدلنے سے بہت اچھا ہو گیا۔ جو شعر بے تصرف بدستور رہا اس کا ذکر کچھ ضرور نہیں۔

ساقی ابھی چھنی[1] الخ

چھنی لفظ غریب ہے، نہ اہل دہلی کے زبان زد، نہ گوش زد۔ غربال کو چھلنی کہتے ہیں جس کی فارسی پرویزن ہے اور جس کپڑے میں سیالات کو چھانیں، فارسی اسی کی "لاے پالا" اور اردو "صافی" ہے بہ یائے معروف "برابر نہ ہوا تھا" الخ تقرر وقت مرگ کا انکار حشو بلکہ مہمل ہے، مگر ہاں تقرر کا وقت ازل کو قرار دیا جائے۔ مقطع میری پسند نہیں ہے، میرے سر کی قسم اس کو نہ رکھو، اور مقطع لکھ لو۔ ۱۲

شنبہ ۱۴۔ نومبر ۱۸۶۳ء   غالب

---

[1] اس خط سے اس کی شہادت ملتی ہے کہ ذکاؔ نے ابتدا میں اپنا اردو کلام بھی اصلاح کے لئے بھیجا ہے لیکن ذکاؔ کا اردو کلام نایاب ہے۔ اور انہوں نے میرزا سے فارسی ہی میں زیادہ اصلاح لی ہے۔

www.taemeernews.com

بندہ پرور،

تمہارے دونوں خط پہنچے۔ غالب گسستہ دم، کوتہ قلم، نہ لکھے تو یہ اور بات ہے۔ دونوں خط آپ کے اور ایک پارسل محمد نجیب خاں کا بہ تقدیم و تاخیر دو سہ روز موصول ہوئے۔ آپ کا پارسل بعد مشاہدہ آپ کو بھیجا جائے گا۔ خانصاحب کے پارسل میں ایک کتاب ارمغان اور اوراق اصلاح بھیجے جائیں گے۔

اہاہا! "محرق قاطع" کا تمہارے پاس پہنچنا:

کامے کہ خواستم ز خدا شد میسرم

میں اس خرافات کا جواب کیا لکھتا؟ مگر ہاں سخن فہم دوستوں کو غصہ آ گیا۔ ایک صاحب نے فارسی عبارت میں اس کے عیوب ظاہر کیے[1]۔ دو طالب علموں نے اردو زبان میں دو رسالے[2] جدا جدا لکھے۔ دانا ہو اور منصف ہو" محرق" کو دیکھ کر جانو گے

---

[1] دافع ہذیان مولفہ مولوی نجف علی۔

[2] سوالات عبدالکریم اور لطائف غیبی۔ میرے نزدیک یہ دونوں کتابیں غالب نے خود لکھی تھیں۔ ایک عبدالکریم کے نام سے چھپی۔ دوسری سیف الحق میاں داد خاں سیاح کے نام سے (مولانا مہر)

www.taemeernews.com

کہ مؤلف اس کا احمق ہے اور جب وہ احمق "دافع ہذیان" و"سوالات عبدالکریم" اور "لطائف غیبی" کو پڑھ کر متنبہ نہ ہوا اور "محرق" کو دھونڈا تو معلوم ہوا کہ بے حیا بھی ہے۔ "دافع ہذیان" "سوالات" "لطائف غیبی" تینوں نسخے ایک پارسل میں اس خط کے ساتھ روانہ ہوتے ہیں۔ یقین ہے کہ بتقدیم و تاخیر یک دو روز نظر انور سے گزریں۔ فی الحال اس پارسل کی رسید لفور ورود لکھئے۔ جب آپ کا بھیجا ہوا نسخہ مسترد پہنچے تو اس کی رسید رقم کی جائے گی۔ چار نسخے پارسل میں ہیں: دو آپ لیجئے اور دو محمد نجیب خاں کو دیجیے۔

دوشنبہ ۲۸۔ نومبر ۱۸۶۴ء غالب

(۷)

بندہ پرور،

کل آپ کا تفقد نامہ پہنچا، آج میں پاسخ طراز ہوا۔ جس کاغذ پر میں نقوش کھینچ رہا ہوں، آپ کے خط کا دوسرا سرورق ہے، پہچان لیجئے اور معلوم کیجئے کہ آپ کا مجموعہ کلام معجز نظام اور اس کے بعد دو خط پہنچے ہیں صحیفہ شریف کی رسید لکھ چکا ہوں، بلکہ اسی خط میں محمد نجیب خاں کو سلام اور ارمغان کا شکر اور اوراق اشعار اصلاح طلب کی رسید میں نے لکھدی ہے۔ پارسل کے سرنامہ سے میرا نام

www.taemeernews.com

نہیں، پارسل تلف ہوا نہیں۔ آٹھ دس روز ہوئے ہوں گے کہ وہ مجلد اسی پارسل میں کہ اس کو مدگرداں کر لیا ہے، بعد ادائے محصول آپ کا نام لکھ کر روانہ کر دیا ہے۔ یقین ہے کہ بعد آپ کے خط کی روانگی کے آپ کے پاس پہنچ گیا ہوگا۔

ہاں صاحب خط دیروزہ کے ساتھ ایک خط مولوی نجف علی صاحب کے نام، مع اس حکم کے کہ میں اس کو مولوی صاحب کے پاس پہنچا دوں، میں نے پایا۔ حال یہ ہے کہ مولوی صاحب سے میری ملاقات نہیں۔ صرف اتحاد معنوی کے اقتضا سے انھوں نے دافع ہذیاں لکھ کر فن سخن میں مجھ کو مدد دی ہے۔ منشی گوبند سنگھ دہلوی ایک اُن کے شاگرد اور میرے آشنا ہیں۔ ان کو وہ خط بجنسہٖ بھیج دیا۔ یقین ہے کہ وہ مولوی نجف علی صاحب کو بھیج دیں گے۔ انھیں کے اظہار سے دریافت ہوا کہ مولوی صاحب مرشد آباد بنگالے میں ہیں۔ نواب ناظم نے ان کو ذکر رکھ لیا ہے۔ ہر شخص نے بقدر حال ایک ایک قدردان پایا۔ غالب سوختہ اختر کو ہنر کی داد بھی نہ ملی:

کسم بخود نہ پذیرفت و دہر بازم برد
چو نامہ کہ بود نا نوشتہ عنوانش

www.taemeernews.com

یہ شعر میرا ہے۔ ولیعہد خسرو[1] دہلی میرزا فتح الملک بہادر[2] مغفور کے قصیدے کا اور دیکھو ایک رباعی میری:

دستم بہ کلید مخزنے می بایست	در بود تہی بہ دامنے می بایست
یا ہیچ گہم بکس نیفتادے کار	یا خود بہ زمانہ چوں منے می بایست

انا للہ وانا الیہ راجعون

(۸)

اے عنایت بہ عنایت ہم شکل

آپ کا خط حاوی حل شبہات جس دن پہنچا اس کے دوسرے دن جواب لکھ کر بھیج دیا۔ دو مصرعوں میں دو لفظ بدلے گئے۔ دو شعروں کے باب میں کچھ تقریر درج ہوئی۔ دو تین شعروں میں تمہاری رائے مسلم رہی۔ باوجود فقدان حافظہ واستیلائے نسیان ایک مصرع کا بدلا ہوا لفظ یاد ہے:

چہ غرہ غرہ پیشانی سمند عمر

بدل مصرع: چہ غرہ غرہ پیشانی تگا دو عمر

---

[1] بہادر شاہ ثانی

[2] فخرالدین عرف مرزا فخرو، غالب کے شاگرد تھے۔ ۱۸۵۶ء میں فوت ہوئے۔

www.taemeernews.com

دوسرا تبدل اسی قدر یاد رہ گیا ہے کہ "شبگیر دگرداں رکاب"
کچھ اسی طرح کے دو لفظ تھے، بے واؤ عاطفہ کچھ تقدم و تاخر ہو
گیا ہے ۱۲

صبح شنبہ ۳۔ ذی الحجہ مطابق یکم مئی سال حال ۱۲
(۱۲۸۲ھ - ۱۸۶۶ء)

غالب

(۹)

میرے مشفق میرے شفیق، مجھ سے سچ پوچ کے ماننے والے،
مجھ سے بُرے کو اچھا جاننے والے میرے محب، میرے محبوب،
تم کو میری خبر بھی ہے؟ آگے ناتواں تھا، اب نیم جاں ہوں۔ آگے
بہرا تھا، اب اندھا ہوا چاہتا ہوں۔ رام پور کے سفر کا[1] آوردہ ہے، رعشہ
وضعف بصر۔ جہاں چار سطریں لکھیں انگلیاں ٹیڑھی ہوگئیں، حرف
سوجھنے سے رہ گئے۔ اکہتر برس جیا، بہت جیا۔ اب زندگی
برسوں کی نہیں مہینوں اور دنوں کی ہے۔

یہ پہلا خط تمہارا پہنچا، اس سے تمہارا مریض ہونا معلوم ہوا۔ متواتر
دوسرا خط مع غزل آیا۔ غزل کو دیکھا سب شعر اچھے اور لطیف۔
حافظے کا یہ حال ہے کہ غزل کی زمین یاد نہیں، اتنا یاد ہے

---

[1] تحفہ جو سفر سے لایا جائے۔ (مولانا مہر)

www.taemeernews.com

کہ ایک لفظ میں کوئی شعر بلا گیا تھا۔ غرضکہ وہ غزل بعد مشاہدہ تم کو بھیجی گئی اور لکھا گیا کہ نوید حصول صحت جلد بھیجو۔

کل ایک خط رجسٹری دار آیا، گویا ستارہ دنبالہ دار آیا

حیران کہ ماجرا کیا ہے۔ بارے کھولا اور دیکھا۔ خط نوید رفع مرض وحصول صحت سے خالی اور شکوہ ہائے بے جا سے لبریز۔

صاحب میرے نام کا خط جہاں سے روانہ ہو، وہیں رہ جائے تو رہ جائے ورنہ دلی کے ڈاک خانہ میں پہنچ کر کیا مجال ہے، جو مجھ تک نہ پہنچے۔ وہاں کے ڈاک کے کارپردازوں کو اختیار ہے مکتوب الیہ کو دیں یا نہ دیں۔ آپ مرزا صابر[1] کا تذکرہ مانگتے ہیں، اس کا حال یہ ہے کہ غدر سے پہلے چھپا اور غدر میں تاراج ہوگیا۔ اب ایک مجلد اس کا کہیں نظر نہیں آتا۔

بس اب مجھے اتنا لکھنا باقی ہے کہ اس خط کی رسید اور اپنی خیر و عافیت جلدی لکھو۔

صبح جمعہ ۲۵۔ ذی حجہ ۱۲۸۲ھ، ۱۲ مئی ۱۸۶۶ء جواب کا طالب غالب

---

[1] میرزا قادر بخش صابر معزالدین جہاندار بادشاہ دلی کی اولاد میں سے تھے۔ "گلستان سخن" کے نام سے شعراء کا تذکرہ لکھا تھا، جو بہت کمیاب ہے۔ مولانا امام بخش صہبائی کے شاگرد تھے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ تذکرہ خود صہبائی نے لکھا تھا اور صہبائی کے نام سے شائع ہوا۔
(مولانا مہر)

www.taemeernews.com

(۱۰)

دوست روحانی، برادر ایمانی، مولوی حبیب اللہ خاں میر منشی کو فقیر غالب کا سلام۔ تم نے یوسف علی خاں کو کہاں سے ڈھونڈ نکالا اور ان کا تخلص اور ان کا خطاب کس سے معلوم کیا؟ بغیر نشان محلہ کے ان کو خط کیوں کر بھیجا اور وہ خط ان کو کیوں کر پہنچا؟:

حیرت اندر حیرت است اے یار من

پہلے یہ تو کہو کہ "درفش کاویانی" اور وہ قطعہ جس کی پہلی بیت یہ ہے تم کو پہنچا ہے یا نہیں؟ اگر پہنچا تو مجھ کو رسید کیوں نہ لکھی؟

مولوی احمد علی احمدؔ تخلص نسخہ درخصوص گفتگوے پارس انشا کردہ است

اگر یہ پارسل پہنچ گیا ہے تو رسید لکھو اور دیباچہ ثانی مبدید کی داد دو اور اگر نہیں پہنچا تو مجھ کو اطلاع ہو کہ ایک نسخہ اور بھیجوں۔

زلیستن دشوار۔ اس مہینے یعنی رجب کی آٹھویں تاریخ تہتر واں برس شروع ہوا۔ غذا صبح کو سات بادام کا شیرہ، قند کے شربت کے ساتھ، دوپہر کو سیر بھر گوشت کا گاڑھا پانی، قریب کبھی کبھی تین تلے ہوئے کباب۔ چھ گھڑی رات گئے پانچ روپیہ بھر شراب خانہ ساز اور اسی قدر عرق شیر۔

اعصاب کے ضعف کا یہ حال کہ اُٹھ نہیں سکتا اور اگر دونوں

www.taemeernews.com

ہاتھ ٹیک کر، چار پایہ بن کر اٹھتا ہوں، تو پنڈلیاں لرزتی ہیں۔ معہذا دن بھر میں دس بارہ بار اور اسی قدر رات بھر میں پیشاب کی حاجت ہوتی ہے۔ حاجتی پلنگ کے پاس لگی رہتی ہے، اٹھا اور پیشاب کیا اور پڑ رہا۔ اسباب حیات میں سے یہ بات ہے کہ شب کو بدخواب نہیں ہوتا۔ بعد اراقت بول بے تکلف نیند آجاتی ہے۔ ایک سو باسٹھ روپے آٹھ آنے کی آمد، تین سو کا خرچ، ہر مہینے میں ایک سو چالیس کا گھاٹا۔ کہو زندگی دشوار ہے یا نہیں؟ مردن ناگوار بدیہی ہے، مرنا کیونکر گوارا ہوگا؟

بھائی یہ خط ازراہ احتیاط بیرنگ بھیجتا ہوں۔

جواب خط کا طالب، غالب

سہ شنبہ از روے جنتری ۲۶ اور از روے رویت ۲۵ رجب ۱۲۸۳ھ اور ۴۔ ڈسمبر ۱۸۶۶ء

(۱۱)

جانان بلکہ جان، مولوی منشی حبیب اللہ خاں کو غالب خستہ دل کا سلام اور نور دیدہ وسر دریںہ منشی محمد میراں[1] کو دعا اور مجھ کو فرزند ارجمند کی

---

[1] محمد میراں فرزند میر حبیب اللہ ذکا

www.taemeernews.com

نوید جو نگارش صاحبزادے کی طرف سے تھی، رسم الخط بعینہٖ تمہاری تھی۔ اب تم بتاؤ کہ رقعہ اس کی طرف سے تم نے لکھا ہے یا خود اس نے تحریر کیا ہے؟ لڑکا تمہارا تمہارے ساتھ حیدرآباد نہیں آیا، ظاہر اب تم نے وطن سے بلایا ہے۔ مفصل لکھو کہ نخل مراد کا ثمر یہی ہے یا اس کے کوئی بھائی بہن اور بھی ہے؟ یہ اکیلا آیا ہے یا قبائل کو بھی اس کے ساتھ تم نے بلایا ہے؟ ہاں صاحب، محمد میراں یہ اسم مقتضی اس کا ہے کہ آپ قوم کے سید ہوں۔ منشاء افراط پرسش وفور محبت ہے نہ فضولی۔

یوسف علی خاں شریف و عالی خاندان ہیں۔ بادشاہ دہلی کی سرکار سے تیس روپے مہینہ پاتے تھے۔ جہاں سلطنت گئی تنخواہ بھی گئی۔ شاعر ہیں ریختہ کہتے ہیں۔ ہوس پیشہ ہیں، مضطر ہیں۔ ہر مدعا کے حصول کو آسان سمجھتے ہیں علم اسی قدر ہے کہ لکھ پڑھ لیتے ہیں۔ ان کا باپ میرا دوست تھا۔ میں ان کو بجائے فرزند سمجھتا ہوں اپنی بقدر دست گاہ کے کچھ مہینہ مقرر کر دیا ہے، مگر بہ سبب کثرت عیال وہ ان کو مکتفی نہیں۔ تم ان کی درخواست کے جواب سے قطع نظر نہ کرو گے تو کیا کرو گے؟

صاحب میں بعین عنایت الٰہی کثیر الاحباب ہوں۔ ایک دوست

www.taemeernews.com

نے کلکتہ سے مجھے اطلاع دی کہ مولوی احمد علی مدرس مدرسۂ کلکتہ نے ایک رسالہ لکھا ہے، نام اس کا "موئد برہان" ہے۔ اس رسالہ میں دفع کئے ہیں تیرے وہ اعتراض جو تو نے دکنی پہ کئے ہیں اور تحریر پہ کیے ہیں اور تحریر پہ کچھ اعتراضات وارد کئے ہیں اور اہل مدرسہ اور شعرائے کلکتہ نے تقریظیں اور تاریخیں بڑی دھوم کی لکھی ہیں۔ بس بھائی میں نے اتنے علم پر ایک قطعہ لکھ کر چھپوایا اور کئی ورق اس دوست کو اور دو چار جلدیں "درفش کاویانی" علاوہ اوراق مذکور بھیج دیئے اسی زمانے میں تین چار ورق خوب یاد ہے کہ "درفش" کی جلد میں رکھ کر تم کو بھیجے ہیں یا تو مجھے غلط یاد ہے یا تم نے "درفش" کو کھول کر دیکھا نہیں۔ وہ اوراق مع "درفش" زینت طاق نسیاں ہیں۔ وہ ورق اس لفافے میں اپنے نزدیک مکرر بھیجتا ہوں۔ تم بھی دیکھو اور صاحبزادہ بھی دیکھے اور یہ جانے کہ فی الحال نظم فارسی یہی ہے اور بس۔

ہاں صاحب اودھ اخبار میں ایک قصیدہ غلام امام کا دیکھا، "مکاں تنگ است" "جہاں تنگ است" مدح مختار الملک میں، متضمن استدعائے مسکن وسیع۔ پھر مہینے بعد اسی "اودھ اخبار" میں یہ خبر دیکھی کہ نواب نے مسکن تو نہ بدلا، مگر تیس روپے

www.taemeernews.com

مہینہ بڑھا دیا۔ اسی اخبار میں پھر دیکھا کہ ایک صاحب نے مولوی غلام امام کے کلام پر اعتراض کیا ہے اور ان کے شاگرد وضیع تخلص نے اس کا جواب لکھا ہے۔ آپ سے اس روئداد کی تفصیل اور جواب اعتراض و معترض کے نام کا طالب ہوں، بسبیل استعجاب۔

دوشنبہ ۱۹۔ شعبان ۱۲۸۴ھ ہجری (مطابق ۱۱۔ جنوری ۱۸۶۷ء)

(۱۲)

بھائی، میں نہیں جانتا کہ تم کو مجھ سے اتنی ارادت اور مجھ کو تم سے اتنی محبت کیوں ہے۔ ظاہراً معاملہ ارواح ہے۔ اسباب ظاہری کو اس میں دخل نہیں۔ تمہارے خط کا جواب مع اوراق مسودہ روانہ ہو چکا ہے، وقت پر پہنچے گا۔ "سترا بہترا" اردو میں ترجمہ ہیر خرف ہے۔ میری تہتر برس کی عمر ہے، پس میں ''اخرف'' ہوا۔ گویا حافظہ کبھی تھا ہی نہیں۔ سامعہ باطل بہت دن سے تھا، رفتہ رفتہ وہ بھی حافظے کی طرح معدوم ہو گیا۔ اب مہینہ بھر سے یہ حال ہے کہ جو دوست آتے ہیں، رسمی پرسش مزاج سے بڑھ کر جو بات ہوتی ہے، وہ کاغذ پر لکھ دیتے ہیں۔ غذا مفقود ہے۔ صبح کو قند اور شیرۂ بادام مقشر، دوپہر کو گوشت کا پانی، سرِ شام گوشت کے تلے ہوئے چار کباب، سوتے ہوئے پانچ روپے بھر شراب اور اسی قدر گلاب۔ خرف ہوں، پوچ

www.taemeernews.com

ہوں، عاصی ہوں، فاسق ہوں، روسیاہ ہوں۔ یہ شعر میر کا میرے حسب حال ہے:

مشہور ہیں عالم میں مگر ہوں بھی کہیں تم
القصہ نہ در پے ہو ہمارے کہ نہیں ہم

آج اس وقت کچھ افاقت تھی۔ ایک اور خط ضروری لکھنا تھا۔ بکس کھولا تو تمہارا خط نظر پڑا۔ مکرر پڑھنے سے معلوم ہوا کہ بعض مطالب کے جواب لکھے نہیں گئے

ناچار اب کتابت جداگانہ میں لکھتا ہوں تاکہ خلعت کا حال اور میرے حالات تم کو معلوم ہو جائیں کہ میں قوم کا ترک سلجوقی ہوں۔ دادا میرا ماوراءالنہر سے شاہ عالم کے وقت ہندوستان میں آیا۔ سلطنت ضعیف ہوگئی تھی، صرف پچاس گھوڑے نقارہ شان سے شاہ عالم[1] کا نوکر ہوا۔ ایک پرگنہ سیر حاصل ذات کی تنخواہ اور رسالے کی تنخواہ میں پایا۔

---

[1] شاہ عالم ثانی بادشاہ دہلی جو ۱۷۵۹ء میں تخت نشین ہوا، اور ۱۸۰۶ء میں مرا۔ غالب نے کئی جگہ لکھا ہے کہ اس کا دادا عالم شاہ کے عہد میں ہندوستان آیا اور لاہور میں معین الملک کے پاس ملازم ہوا۔ معین الملک نے شاہ عالم کی تخت نشینی سے سات آٹھ برس پہلے وفات پائی۔ لہٰذا میرزا کا دادا احمد شاہ کے عہد میں ہندوستان آیا نہ کہ شاہ عالم کے عہد میں۔ البتہ دہلی میں ملازمت شاہ عالم ہی کے عہد میں ہوئی ہوگی۔
(مولانا مہر)

www.taemeernews.com

بعد انتقال اس کے جو طوائف الملوک کا ہنگامہ گرم تھا' وہ علاقہ نہ رہا۔ باپ میرا عبداللہ بیگ خاں بہادر لکھنؤ جا کر نواب آصف الدولہ[1] کا نوکر رہا۔ بعد چند روز حیدرآباد جا کر نواب نظام علی خاں کا نوکر ہوا۔ تین سو سواروں کی جمعیت سے ملازم رہا۔ کئی برس وہاں رہا۔ وہ نوکری ایک خانہ جنگی کے بکھیڑے میں جاتی رہی۔ والد نے گھبرا کر الور کا قصد کیا۔ راؤ راجہ بختاور سنگھ[2] کا نوکر ہوا۔ وہاں کسی لڑائی میں مارا گیا۔ نصراللہ بیگ خاں بہادر میرا حقیقی چچا مرہٹوں کی طرف سے اکبرآباد کا صوبہ دار تھا' اس نے مجھے پالا۔ ۱۸۰۳ء میں جب جرنیل لیک صاحب کا عمل ہوا۔ صوبہ داری کمشنری ہو گئی اور صاحب کمشنر ایک انگریز مقرر ہوا۔ میرے چچا کو جرنیل لیک صاحب نے سواروں کی بھرتی کا حکم دیا۔ چار سو سوار کا برگڈیر ہوا۔ ایک ہزار سات سو روپے ذات کا اور لاکھ

---

[1] آصف الدولہ ابن شجاع الدولہ نواب وزیر اودھ۔

[2] اس کا تفصیلی ذکر ہم نے کتاب ہذا کے باب "عہد غالب کے حیدرآباد" میں کیا ہے۔

[3] والی الور

[4]

www.taemeernews.com

ڈیڑھ لاکھ روپیہ سال کی جاگیر حین حیات علاوہ سال بھر مرزبانی کے تھی کہ بمرگ ناگاہ مرگیا۔ رسالہ برطرف ہوگیا، ملک کے عوض نقدی مقرر ہوگئی وہ اب تک پاتا ہوں۔ پانچ برس کا تھا جو باپ مرگیا۔ آٹھ برس کا تھا جو چچا مرگیا۔ سنہ ۱۸۳۰ء[1] میں کلکتے گیا۔ نواب گورنر سے ملنے کی درخواست کی دفتر دیکھا گیا۔ میری ریاست کا حال معلوم کیا گیا۔ ملازمت ہوئی، سات پارچے اور جیغہ، سرپیچ مالائے مروارید، یہ تین رقم خلعت ملا۔ ناں بعد جب دہلی میں دربار ہوا، مجھ کو بھی خلعت ملتا رہا۔ بعد غدر بجرم مصاحبت بہادر شاہ، دربار و خلعت دونوں بند ہوگئے۔ میری برأت کی درخواست گزری۔ تحقیقات ہوتی رہی۔ تین برس کے بعد نیڈ چھٹا۔ اب خلعت معمولی ملا۔ غرض کہ یہ خلعت ریاست کا ہے، عوض خدمت نہیں، انعامی نہیں، معوج الذہن نہیں ہوں، غلط فہم نہیں ہوں، بدگمان نہیں ہوں۔ جو جس کو سمجھ لیا اس میں فرق نہیں آتا، دوست سے راز نہیں چھپاتا۔ کسی صاحب نے حیدرآباد سے گمنام خط ڈاک میں بھیجا۔ بند بری طرح کیا تھا۔ کھولنے میں سطر کٹ گئی۔ بارے مطلب ہاتھ سے نہیں جاتا۔ بھیجنے والی کی غرض یہ تھی کہ مجھ کو تم سے رنج و

---

[1] صحیح یہ ہے کہ میرزا ۱۸۲۷ء میں کلکتہ گئے اور ۱۸۲۹ء میں واپس آئے۔
(مولانا مہر)

www.taemeernews.com

لال ہو، قدرت خدا کی میری محبت اور بڑھ گئی اور میں نے جانا کہ تم مجھے دل سے چاہتے ہو۔ وہ خط بجنسہٖ تمہارے پاس اس خط میں ملفوف کر کے بھیجتا ہوں۔ زنہار دستخط پہچان کر کاتب سے جھگڑا نہ کرنا۔ مدعا اس خط کے بھیجنے سے یہ ہے کہ تمہاری ترقی منصب اور افزونی مشاہرہ اس خط سے مجھے معلوم ہوئی تھی۔

صبح جمعہ دہم شوال ۱۲۸۳ھ، ۱۵۔ فروری ۱۸۶۷ء

(۱۳)

جان غالب،

تم نے بہت دن سے مجھ کو یاد نہیں کیا۔ ایک خط میرا ضروری جواب طلب گیا ہوا ہے اور آمد و رفت ڈاک کی مدت گزر گئی۔ اس کا جواب تو سو کام چھوڑ کر لکھنا تھا۔ "مؤید برہان" میرے پاس بھی آ گئی ہے اور میں اس کی خرافات کا حال بقید شمار صفحہ و سطر لکھ رہا ہوں، وہ تمہارے پاس بھیجوں گا۔ شرط مودت، بشرط آنکہ جاتی نہ رہی ہو اور باقی ہو، یہ ہے کہ میں ہوں یا نہ ہوں تم اس کا جواب لکھو۔ میرے بھیجے ہوئے اقوال جہاں جہاں مناسب جانو درج کر دو۔ میں اب قریب مرگ ہوں۔ غذا بالکل مفقود اور امراض مستولی۔ بہتر برس کی عمر۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ میاں محمد میراں کو

www.taemeernews.com

دعا۔

۱۴- مارچ ۱۸۶۷ء　　　　جواب کا طالب، غالب

(۱۴)

بندہ پرور،

آپ کا مہربانی نامہ پہنچا۔ تمہاری اور صاحبزادے کی خیر و عافیت معلوم ہونے سے دل خوش ہوا۔ جو آپ کی عبارت سے سمجھ گیا ہوں، اس کا جواب لیجئے اور جو نہیں سمجھا وہ مطابق میری التماس کے مجھے سمجھا دیجئے۔ عماد، عمائد شعرائے قدیم میں سے ہے۔ اس کی پانچ سات بیت کی ایک غزل ہے، جس کا مطلع یہ ہے،

پائے سرتا نشود راہ تو رفتن سواں
جز بہ جاروب مژہ کوے تو رفتن نتواں

پہلے مصرع میں رے مفتوح اور دوسرے مصرع میں مضموم۔ باقی اشعار میں گفتن و سفتن وغیرہ قافیئے ہیں۔ اُستاد دو مصرعوں میں حرکت ماقبل ردی مختلف لایا۔ اگر میں نے پچاس شعر کے قصیدے میں ایک شعر ایسا لکھا تو کیا غضب ہوا؟ آیا معترض صاحب استناد بمثل و نظیر کو نہیں جانتے اور نہیں مانتے؟ یہ دستور میرا نکالا ہوا نہیں، قدیم سے ہے۔

www.taemeernews.com

بندہ نواز میں نے لکھا کہ "مؤید برہان" میرے پاس آگئی ہے اور میں اس کے اعتراضات کے جواب بہ نشان صفحہ و سطر کا ایک تختہ کاغذ پر لکھ رہا ہوں۔ بعد اتمام نگارش تمہارے پاس اس مراد سے بھیجوں گا کہ تم ازراہ عنایت "مؤید" کا جواب لکھو۔ میری نگارش جو پسند آئے اس کو بھی جابجا درج کر دو۔ تم نے اس درخواست کا جواب ہاں، نا، کچھ نہ لکھا[1]۔ اب عنایت فرما کر ان تینوں باتوں کا جواب لکھیئے۔ میاں محمد میراں کو دعا۔

۱۸- مارچ ۱۸۶۷ء

(۱۵)

منشی صاحب، الطاف نشان، سعادت و اقبال توامان، منشی حبیب اللہ خاں کو غالب سوختہ اختر کی دعا پہنچے۔ تمہارا خط پہنچا، پڑھ کر دل خوش ہوا۔ تم میری بات پوچھتے ہو، لیکن میں کیا لکھوں؟ انگلیاں کہنے میں نہیں۔ ایک آنکھ کی بینائی زائل۔ جب کوئی دوست آجاتا ہے تو اس خط کا جواب لکھوا دیتا ہوں۔ مشہور

---

[1] ملاحظہ ہو خط ۱۲، جو ۱۴- مارچ کو لکھا گیا تھا معلوم نہیں چار دن کے اندر اندر اثبات یا نفی میں جواب کی امید کیوں پیدا ہوئی؟ ہاں یا ۱۴- مارچ کے خط کو ۴- مارچ کو سمجھا جائے۔ (مولانا مہر)

www.taemeernews.com

ہے یہ بات کہ جو کوئی اپنے عزیز کی فاتحہ دلاتا ہے، موتی کی روح کو اس کی بو پہنچتی ہے۔ ایسے ہی میں سونگھ لیتا ہوں غذا کو۔ پہلے مقدار غذا تولوں پر منحصر تھی، اب ماشوں پر ہے۔ زندگی کی توقع آگے مہینوں پر تھی اب دنوں پر ہے۔ بھائی اس میں کچھ مبالغہ نہیں ہے، بالکل میرا یہی حال ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اپنی مرگ کا طالب غالبؔ

دوم شوال ۱۲۸۴ھ (مطابق ۲۷۔ جنوری ۱۸۶۸ء)

(۱۶)

بندہ پرور! پرسوں مولوی صاحب کا خط آیا۔ ماکتب فیہ بسبیل نقل یہ..... (جگہ چھوڑ دی ہے) آج مسودہ عرضداشت کا جو آپ نے مجھ کو بھیجا تھا۔ پیش گاہ آقائی نامدار گزرانا، اور اپنے نام کے خط کا بھی پیش کرنا مناسب جانا۔ بعد ملاحظہ کے یوں ارشاد ہوا کہ قصیدہ اور عرضداشت کی تفتیش اور تلاش کی جائے، جو دارالانشا میں ملی تو جواب لکھا جاوے یقین ہے کہ بعد گردآوری کاغذات کے اگر عرضداشت مل گئی یا قصیدہ نکل گیا تو جواب ملے گا۔ ۱۲

اب میں بقول صائبؔ

درماندۂ کارِ خودم حیرانِ اطوارِ خودم ہر لحظہ دارد نیستی جوقرعۂ رمّال ہا

www.taemeernews.com

یوں سمجھا ہوا تھا کہ نوّں لفافے جو علی التواتر یکے بعد دیگرے ارسال ہوئے ہیں جتواتر دارالانشا میں پہنچے اور منشی نے چاک کر کے پھینک دئیے ہوں۔ مانا کہ یوں ہی ہوا۔ بشرط التفات مولانا میرا مطلب اس صورت بھی فوت نہیں ہوتا یعنی مولوی صاحب کہہ سکتے ہیں کہ جو نذر اس کی میری معرفت گزری ہے اس کے قبول ہونے کی عزاطلاع میں وہی لکھا جائے جو قصیدہ و عرضداشت کے گزارنے کے بعد لکھا جاتا۔ مولوی مویدالدین صاحب جو حضرت کے مقرب درا وس حضرت میں میرے مقرب ہیں' یہ کلمہ موجز کہہ سکتے ہیں مگر میں اُنسے نہیں کہہ سکتا کہ آیا نوّں کاغذ دفتر سے نکل کر پیش ہوئے یا نہیں ۱۲

آگے اس سے جس دن دیوان کا پارسل اور خط مولانا کو بھیجا ہے۔

اس کے دوسرے دن ایک پارسل اور ایک خط آپ کو میں نے بھیجا ہے۔ آج تک اس پارسل کی رسید میں نے نہیں پائی۔ سخت متشوش ہوں۔ اگر وہ پارسل پہنچ گیا ہے تو اس کی رسید لکھیئے۔ اور اگر نہیں پہنچا تو وہاں کے ڈاک گھر میں دریافت کیجیے اور میرے اس خط کا جواب لکھیئے۔

نجات کا طالب غالب ۱۲

ہاں، خوب یاد آیا وہ قصیدہ بھی اس کلیات میں مطبوع ہو گیا ہے صفحہ ۳۴۶ سطر ۱۲۔ دفتر سے قصیدے کا کاغذ نکلنے کی صورت میں بھی قصیدہ ممدوح کی نظر سے گزر سکتا ہے۔ وسلام مع الاکرام [1]

---

[1] یہ خط اسٹیٹ سنٹرل لائبریری آندھرا پردیش میں محفوظ ہے۔

www.taemeernews.com

(۱۷)

به مولوی محمد حبیب الله منشی نواب مختار الملک نایب والی حیدرآباد

یزدان را ببخشندگی سپاس، وبخت را به فرخی آفرین وآرزو را بروائی نوید ہما نا امید افزا نامہ یافتہ ام کہ پندارم فرد فہرست کالای آلائی است، از فرازستان بروی زمین رسے من فرو فرستادہ اند یا گنجنامہ گران از گنجی است کہ درنا آغاز روز بنام من از مہر مہربان نہادہ اند، ہر آئینہ بدین رو نیز شادمانم کہ رنگا رنگ متاع سعادت درراہ است وہنگام پدید آمدن گنجینہ مراد نزدیک، ہرچند نامہ نہ منشور خدایگانست نازش بفرخندی این نشانست کہ نام چون من گوشہ نشینے روز خوش بینی دران ہمایون دفتر بنشستہ آمد

فرد غالب بخود ببال کہ گشتیم روشناس
در دفتر وزیر نوشتند نام ما

شگفت آورد رودادیست گفتنی ودیدنی مایہ گرایش کہ از دوربہ صریر خامہ گوش نہند، سپاس پذیرفتنی درماہ گذشتہ کہ بقضای عمر فزائی سال اگست بیستایش وصفر از پس ہمی گذشت منتخب دیوان ریختہ کہ تازہ بکالبد انطباعش فرو ریختہ اند در مومین جامہ نہادہ بنظر گاہ روشنان گذرگاہ حضرت فلک رفعت آصف سلیمان منزلت فرستادہ ام چون درود سامی صحیفہ

www.taemeernews.com

براثر ارسال پارسل اتفاق افتاد در اندیشه همی سنجم که مگر این نگارش حسب الحکم پیشگاه وزارت بوده است و بمیان نیامدن سخن از رسیدن سفینهٔ اردو و خواهش مجموعهٔ نظم فارسی در گیرنده بدین اشارت بوده است که این بیکار ستاید پیش کش آن باید ع

زہی تصور باطل زہے خیال محال

ماه نیم ماه میخواهند آن خود آنمی است که مسمی ندارد چون از سرنوشت گردن نتوان پیچید سرگذشت بازگویم هرگاه یک نیمه از پرتوستان انجامید و مهر نیمروز نام یافت تا نفس راست کرده آید لختی درنگ ورزیده شد ناگاه کارفرما را روز فرو رفت و روزگار سرآمد و دولت دیرینهٔ ترکمانان قراچاریه سپری گشت ماه نیم ماه همچون ماه بست و هشت شنبه ناپدید ارو نام وی بعنوان بی نشانی در مهر نیمروز آشکار ماند هستی ناپذیرفته را چون فرستم سر آئینه چون پنج آهنگ و مهر نیمروز دستنبو دارند آنچه اکنون فرستم مجموعهٔ نظم پارسی تواند بود که جامه گرد آور خود به پیشگاه نداشت و شهریان هر چه داشتند دریں رستخیز نمونهٔ آشوب به یغما رفت پس از تباهی این شهر آراسته و فرو نشستن آن گرد برخاسته یکی از جا همندان که نامه نگار را از خویشاوند آن است گرد پژوهش برآمد چون ژنده پاره پاره بهم دوخته قریب پنجاه جزو فراز آورد اینک در بند آنم که به بند انطباعش درآورند که درین صورت

www.taemeernews.com

مطاع فراوان وخواستاران زا یافتن آں آسان خواہد بود اگر ایں نقش نہ نشست نغز درست نویسندۂ میچ‌یم تا او بر نگار دور ہے رواں دارد دست مزد کاتب مصرف انطباع کتاب نیست کہ بر من گراں باشد و دستم بداں نہ رسد نَباری بودن خواجہ از نامور نشانمنداں ملازمت وزیر ارسطو نظیر سکندر رہنما خود از روی نگارش سراسر آرزش نامی نامہ کہ بنام خود از من بہ نشان دفتر نواب مختار الملک خواستہ اند پیدائی گرفت امید کہ درد لیش نوازی را پایہ فراتر نہند و راز جوئی را آگہی دہند کہ پیوند خواجہ با دفتر وزارت بعلاقہ کدام منصب دگوہر فروزندہ از کدام معدن ست تا بالفاظیکہ با نام سامی از روی بایست فراخور افتد دانا شدہ باشم و سر رشتہ اضافات را در نہانخانہ مافات گم نکنم دیگر آں خواہم کہ رسیدن دیوان اُردو با زنام نیز بنام کہ طلب کلیات فارسی چنانکہ گماں بردہ ام بفرمان حضرت نواب معلی القاب ست یا ہمیں از جانب جناب صحیفہ طراز در ہر دو صورت فرمان پذیری آئین خواہد بود والسلام بالوف الاحترام سہ شنبہ یازدہم ربیع الاول ۱۲۷۸ھ ہجری نبوی ۱۷ ستمبر ۱۸۶۱ء[1]

---

[1] کلیات نثر فارسی صـ۲۳۶ مطبوعہ نولکشور ۱۸۷۱ء کا یہ مکتوب تاریخ کے لحاظ سے ذکا کے نام مرزا کا پہلا مکتوب ہے جو مل سکا ہے۔ لیکن چونکہ یہ فارسی میں ہے اس لئے آخر میں درج کیا جا رہا ہے۔

www.taemeernews.com

بنام میرزا قربان علی بیگ خاں صاحب سالک

(۱)

میری جان، کن اوہام میں گرفتار رہے ہو؟ جہاں باپ کو پیٹ چکا، اب چچا کو بھی رو۔ خدا تجھ کو جیتا رکھے اور تیرے خیالات واحتمالات کو صورت وقوعی دے۔ یہاں خدا سے بھی توقع باقی نہیں، مخلوق کا کیا ذکر؟ کچھ بن نہیں آتی۔ اپنا آپ تماشائی بن گیا ہوں۔ رنج وذلت سے خوش ہوتا ہوں۔ یعنی میں نے اپنے آپ کو اپنا غیر تصوّر کیا ہے۔ جو دُکھ مجھے پہنچتا ہے، کہتا ہوں: لو، غالب کے ایک اور جوتی لگی۔ بہت اِتراتا تھا کہ میں بڑا شاعر اور فارسی داں ہوں۔ آج دور دور تک میرا جواب نہیں۔ لے اب قرضداروں کو جواب دے۔ سچ تو یوں ہے، غالب کیا مرا، بڑا ملحد مرا، بڑا کافر مرا۔ ہم نے ازراہ تعظیم، جیسا بادشاہوں کو بعد ان کے "جنّت آرام گاہ" "عرش نشیمن" خطاب دیتے ہیں، چونکہ یہ اپنے کو شاہ قلمرو سخن جانتا تھا، "سقر مقر" اور "ہاویہ زاویہ"[1] خطاب تجویز کر رکھا ہے۔ "آئیے نجم الدولہ بہادر"[2]! ایک

---

[1] یعنی دوزخ اس کی جائے قرار ہو، ہاویہ اس کا زاویہ بنے۔ (مولانا مہر)

[2] میرزا غالب کو شاہی دربار سے نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ خطاب ملا تھا۔ نجم الدولہ ان کے خطاب کا ایک جزو تھا۔

www.taemeernews.com

قرضدار کا گریبان میں ہاتھ، ایک قرضدار بھوگ سُنا رہا ہے۔ میں اُن سے پوچھ رہا ہوں: "اجی حضرت نواب صاحب! نواب صاحب کیسے او غلان صاحب[1]! آپ سلجوقی اور فراسیابی ہیں۔ یہ کیا بیحرمتی ہو رہی ہے؟ کچھ تو اُکسو، کچھ تو بولو" بولے کیا بے حیا، بے غیرت، کوٹھی سے شراب، گندھی سے گلاب، بزاز سے کپڑا، میوہ فروش سے آم، صراف سے دام قرض لئے جاتا تھا۔ یہ بھی سوچا ہوتا کہاں سے دوں گا۔

(۲)

و للرحمٰن الطاف خفیہ[2]۔ خیر و عافیت تمہاری معلوم ہوئی۔ دم غنیمت ہے جان ہے تو جہان ہے۔ کہتے ہیں خدا سے ناامیدی کُفر ہے۔ میں تو اپنے باب میں خدا سے ناامید ہو کر کافر مطلق ہو گیا ہوں۔ موافق عقیدہ اہل اسلام جب کافر ہو گیا تو مغفرت کی بھی توقع نہ رہی۔ چل بھئی نہ دنیا نہ دین[3]۔ مگر تم حتی الوسع مسلمان بنے رہو اور خدا سے ناامید نہ ہو۔ اِنّ مَع العُسرِ یُسرًا[4] کو اپنا نصب العین رکھو:

---

[1] ترکی زبان میں خطاب کے لئے احترام کا لفظ، جیسے ہمارے ہاں جناب ہے۔ (مولانا مہر)

[2] خدا پوشیدہ مہربانیاں کرتا ہے۔

[3] اس اسلوب تحریر کو یقیناً کرامت سمجھنا چاہئے۔ (مولانا مہر)

[4] قرآن کی آیت کا ٹکڑا ہے جس کے معنی ہیں: تنگی کے ساتھ کشائش بھی ہے۔

www.taemeernews.com

در طریقت ہر چہ پیش سالک آید خیر اوست

گھر میں تمہارے سب طرح خیر و عافیت۔ محمد میرزا پنجشنبہ اور جمعہ کو داستان کے وقت آجاتا ہے۔ رضوان ہر روز شب کو آتا ہے۔ یوسف علی خاں عزیز سلام اور باقر اور حسین علی بندگی کہتے ہیں۔ کلو داروغہ کورنش عرض کرتا ہے۔ اوروں کو یہ پایہ حاصل نہیں کہ وہ کورنش بھی بجا لائیں۔ خط بھیجتے رہا کرو۔ والدعا۔

اپنی مرگ کا طالب غالب

صبح دوشنبہ ۶۔ صفر سال حال (۱۲۸۱ھ) ۱۱۔ جولائی ۱۸۶۴ء

بنام شمس الامرا نائب والیِ حیدرآباد

والا نظرا! سرا گرامی گہرا!
کز فیض تو یافت رونق ایں کہنہ سرا
یارب چہ کسے کہ لفظِ شمس الامرا
جزوے نیست ز اجزاے رقم نام ترا

بہ موقفِ بارگاہ ارم کارگاہ بندگان فرشتہ پاسبان حضرتِ فلک رفعت نوابِ ہمایوں القاب قبلۂ اہلِ عالم نائبِ وزیر اعظم دام اقبالہ زاد افضالہ میرساند یزدان فیروزی بخش توانائی دہ را سپاس کہ بااین ہمہ دوری مہجوری نیست و اگرچہ خود را از نزدیکاں شمارد دور نیست۔

www.taemeernews.com

برہانِ دعویٰ ایں کہ مخدوم و مطاع محمدیانِ آفاق مولانا عبدالرزاق کہ شریفِ مدینہ در صورت صدق و صفا را آئینہ اند گزشتن ذکر خاکسار بہ بزم جاوید بہار ذکر کردہ اند۔ ہمہ دانی و فیض رسانیِ نوابِ خدایگانی آئینہ را بہ صیقل مژدہ و گدا را بہ گنجینہ نوید درد را بہ دوا بشارت و آرزو را بہ روائی امید۔ ہمانا بخت گراں سر آمد و دولت بہ دلجوئی از در درآمد۔ بر ضمیر منیر کہ آئینۂ رازہائے نہان است نہاں نماند کہ شعر و سخن را با نہاد کمترین پیوند روحانی است و خامہ از بدو فطرت در گہر افشانی در آغاز ریختہ گفتی و بہ اُردو زبان غزل سرائے بودے تا پارسی زبان ذوق سخن یافت۔ ازاں وادی عنانِ اندیشہ برتافت۔ دیوانِ مختصرے از ریختہ فراہم آورد و آنرا گلدستۂ طاق نسیاں کرد کما بیش سی سال است کہ اندیشہ پارسی سگال است۔ باآں کہ از بیم شیرداں سپہر دریں کارواں سرائے ہزار درِ گوہرِ شاہوارِ آبرو را پاسبان است و گردندگی خوئے ناساز گار زمانہ را نگراں۔ بہ ذوق بخشی ادائے رقص قلم سرمست است و بہ شادابی نوائے سخن تردست، دریں سپیدہ دم کہ بخت غنودہ بہ چشم نیم باز درمن نگرست و بلبلِ طبع بہ تقاضائے زمزمہ بال فرو کوفت خدا را نیایش و خداوند را ستائش ساز دادہ آمد بستنِ دل در لوامع سحری درے بروئے دل کشاد تا دواں

www.taemeernews.com

روشنی قصیدہ مشتمل بر شصت و ہفت بیت پیوند نگارش پذیرفت۔ چہ قصیدہ از سینہ کہ تابِ غم دراں آتش افروخت نیم سوختہ آہے داز خرمن کہ برق آں را پاک سوخت دودِ اندوہ گیاہے فرخابخت عریضہ نگار کہ بہ دست مایہ چشم داشت قبول روزے چند دل بہ شادمانی نہد و دریں تنہائی دادِ ہمدمیٔ خویش دہد فرد

به التفات تیر زدم درآرزو چہ نزاع
نشاط خاطر مفلس زکیمیا طلبی ست

چنانکہ ہوس می سنجد و آزمی سگالد اگر بندہ پرور را دل بہ پرسش گرم نہ گردد دودِ شرہ را از مہر نم بردن دہد۔ پندارم آں آہِ نیم سوختہ را شعلہ فرو مردہ آں گیاہ دود اندود را باد برداریٔ مدح سرائی است نہ معرکہ آرائی۔ عرضِ بندگی است نہ لافِ ارزندگی۔ کارہا بخت کارساز است۔ بازبان دراز ذریعہ سائل دعائے دولت ست بہ دعویٔ خدمت:

قصیدہ

اے مظہر کل در ازل آثار کرم را
منت بر سر لوح ز رقم تو قلم را

شمس الامرا کز شرف نسبت نامش
نور قبلہ بداد رنگ نشیناں عجم را

یارب عنوان صحیفہ امارت خدایگانی از دفتر قضا بہ توقیع بقائے جاودانی رقم پذیر باد۔[1]

---

[1] کلیاتِ غالب ص ۱۹۲، نو لکشور ۱۸۶۲ء

www.taemeernews.com

عرضداشت بنام نامی نواب مختار الملک نائب والی حیدرآباد

بعد عرض حضرت فلک رفعت نواب معلی القاب آن ارسطوی سکندر مرتبہ آن آصف سلیمان کوکبہ آن نظام الملک ملک شاہ شکوہ کہ قبلہ حاجات مستمندان و کعبۂ آمال سخن پیوا اندمی رساند اگر در سر آغاز عرضداشت معذرت صورت نہ پذیرد پیدا است کہ دیگر این نگارش را محلی و موقعی دست بہم نخواہد داد ناچار بیش ازان کہ در دل گفتہ شود سخن در آں ہمیز د کہ عریضہ نگار درویش گوشہ نشینی بیش نیست اگر در سخن گستری بلند آوازہ باشد گو باش ہر آئینہ خردمی سنجد کہ فرستادن نامہ بی آن کہ روشناس آستان نشینان آن درگاہ شدہ باشم جسارت خواہد بود و این جسارت بہ تصحیف خویش ثمر نخواہد بخشید۔ اگر مشاہدہ شاہد بودی کہ بندگان حاجت خود از خدا میخواہند و آں گستاخی و بی ادبی نیست نتوانستمے عریضہ نگاشتن و پاسخ چشم داشتن بلی بندگان ہم از خدا میخواہند و ہم از خداوند سر رشتہ رد قبول دعا مدعا بدست خدا و خداوند است ناگزارا ند و گوارا نند و او تلخی زہر این غم و تیزی دشنۂ این اندوہ کہ قصیدہ مدحیہ فرستادہ باشم و ندانستہ باشم کہ مطبوع طبع اقدس افتاد یا نہ این

www.taemeernews.com

خود سخنی بود که در سراسیمگی بزبان رفت۔ ہنوز این نیز ندانسته ام که بنظرگاہِ خدایگانہ گذشت یا خود آن عرضہ در عرضِ راہ تلف گشت۔ ناوک پیکان یام گاہ گاہ خطا میکند و چون تیر تخش بہو امیر دو گفتار مرا بخت قبول و مدح مرا ارزش صلہ کجاست، بدینقدر التفات خوشنودم کہ دبیران ہمایون دفتر توقیعی بنام من نویسند تا از رسیدن آن قصیدہ و این عرضداشت آگہی یافتہ بررسائی طالع و بلندی اختر خویش ناز میکردہ باشم ؎

تا چرخ کشد محمل برجیس بقا باد
نواب فلک محمل برجیس شیم را[1]

---

[1] کلیاتِ نثر غالب ص ۲۴۷، نولکشور ۱۸۷۱ء

www.taemeernews.com

قصیدہ در مدح مختار الملک نواب سر سالار جنگ اول

در مدح سخن چنان نگویم — شرطست کہ داستان نگویم
از زہد و ورع سخن نرانم — از سبحہ و طیلسان نگویم
صرف نمد و پلاس دارم — حرف خز و پرنیان نگویم
لب بالب جام بادہ پیوست — از زمزم و ناودان نگویم
تشبیب تہی تو ان سرودن — گیرم کہ ازین و آن نگویم
گویم غم دل بمصرعی چند — زنہار جہان جہان نگویم
از دیدہ و نیشتر نہ گریم — وز دشنہ و استخوان نگویم
در مغز فند شرر بنالم — در سینہ خلدسنان نگویم
از نالہ زبان زبانہ خیزست — سوزد اگرم دہان نگویم
گر تیر بہ من رسد و گر تیغ — دم در کشم الامان نگویم
در خون دو دم ز چشم بر روی — جز لالہ و ارغوان نگویم
باید کہ درین صحیفہ شوق — جز مدح خدایگان نگویم
گوئے کہ چرا نگوئے آری — نتوانم گفت زان نگویم
گفتے کہ بہ پیشگاہ نواب — بسیار مگوے ہان نگویم
مختار الملک را درین عصر — جز آصف جم نشان نگویم

www.taemeernews.com

پاکیزگیِ نہاد پاکش — جز در صف قدسیان نگویم

در مرتبہ کاخِ دولتش را — زین شش در شارسان نگویم

در دیدہ وری و پایہ دانے — ہم سایۂ فرقدان نگویم

شگفت کہ فرقِ فرقدان را — جز پایۂ نردبان نگویم

آن جادہ را کہ تا در دوست — دور است کہ کہکشان نگویم

در پایہ سپہرِ ہفتمین را — بیجاست گر آستان نگویم

وانگاہ بر آستان زحل را — حیف است کہ پاسبان نگویم

تا بارِ تجلی تش نیابم — نیک و بدِ آسمان نگویم

نے نے چو گدای آن در ستم — بد زہرہ ام از عیان نگویم

حاشا کہ ز نالہ باز مانم — تا بر خود مہربان نگویم

فرزانہ بعز و جاہ یکتاست — مشرک بوم ار چنان نگویم

جائے کہ بساط گستراند — افسانۂ آب و نان نگویم

در خور نبود کہ ماہِ نو را — نان ریزہ ظرف خوان نگویم

بالجملہ خوش آنکہ باوی از خویش — جز فرخے روان نگویم

نازم روش سخن سرائے — از گوہر خود نشان نگویم

بدرستم دل آتشین زبانم — از دودۂ دودمان نگویم

در نظم بلند پایہ رندم — والائے خاندان نگویم

www.taemeernews.com

عشق است ظہیر و انوری را — از سنجر و ارسلان نگویم
والا گہر اسپہر جاہلا — اینہا ز رہ گمان نگویم
تنگ است دل از ہجوم اندوہ — میسرم اگر آنچنان نگویم
کس نیست متاع را خریدار — با آنکہ بہا گران نگویم
زان رو کہ خرد دران گیتی — رنجند چو قدردان نگویم
ناچار متاع عرضہ دارم — بیرونقی دکان نگویم
سرمایہ ز دست رفتہ وانگاہ — گاہی سخن از زبان نگویم
اندک خردی بجاست کانرا — جز تازگی بیان نگویم
این بس کہ اگر ز آسمانم — پرسند ز ریسمان نگویم
خود را بہ زبان پہلوی در — مہ کوکبہ پہلوان نگویم
خود را ز سپاسیان نگیرم — فرزانۂ ژند خوان نگویم
ساسان ششم نیم کہ خود را — جز موبد موبدان نگویم
این زمزمہ ہای خونچکان را — شور نامۂ باستان نگویم
کارم بہ محرم و صفر باد — شہریور و مہرگان نگویم
ہم بعد خطاب مدح حاضر — گویم آری چسان نگویم
دستت دم بذل گنج پاش است — چون ابر گہرفشان نگویم
بحر لیست کف تو در روانی — کان را بہ جہان گران نگویم

چون صورت قہر دارد این مدح — برہم زن بحر و کان نگویم
نادان باشم کہ چون تویی را — خاقان جہانستان نگویم
چو پرچم رایت تو بینم — جز اختر کاویان نگویم
امید کہ جز سوال نبود — حرفی کہ درین میان نگویم
ننگم ز سوال نیست اما — با کلک سیہ زبان نگویم
زان رو کہ بہ یمن ایزدی فر — رادے و نہفتہ دان نگویم
گر دابہ رسد بمن زسویت — با غالب خستہ جان نگویم
کان خود ز منست ناتوان تر — بادے سخن از توان نگویم
در خواہش من زمن پژوہی — جز بخشش جاودان نگویم
تاب سفر دکن ندارم — از ناقہ و ساربان نگویم
این نیست نماز پنجگانہ — کش جز بزمان اذان نگویم
کافر باشم اگر ثنایت — پیوستہ زمان زمان نگویم
شتا دم اگر دعای دولت — از ہمنفسان نہان نگویم
آمین شنوم گر از سروشان — با مردم این جہان نگویم[1]

۷۸

---

[1] کلیات نظم غالب، قصیدہ ۶۳، نولکشور ۱۸۶۳ء

www.taemeernews.com

قصیدہ غالب در مدح نواب افضل الدولہ بہادر والی حیدرآباد دکن

حیدرآباد دکن روضۂ رضواں شدہ است — ساز و برگِ طرب و عیشِ فراواں شدہ است

والیِ شہر کہ جا دید بما ناو بدہر — بودہ آصف و امروز سلیماں شدہ است

افضل الدولہ بہادر کہ ز فرِّ رخِ او — بارگہ مطلعِ خورشیدِ درخشاں شدہ است.

آنکہ در عہدِ وے از کثرتِ ایثار و عطا — خلق را یافتنِ کام دل آساں شدہ است

مردہ را زندہ کند جنبشِ کلکش گوئی — کلکِ او موجۂ سرچشمۂ حیواں شدہ است

فرّہ فرہنگِ فریدوں کہ نہاں داشت سپہر — اینک از پردہ دگر بار نمایاں شدہ است

بہ دکن آے و ببیں ریزشِ دستِ کرمش — کہ زمیں ز آبِ گہر غرقۂ طوفاں شدہ است

تا شود روشنیِ چشمِ خلائق افزوں — گردِ در رہگذرش کحلِ صفاہاں شدہ است

نہ ہمیں نیک بود نظمِ امورِ دنیی — کارِ دیں نیز دریں وقت بساماں شدہ است

نفسِ امارہ کہ خود کافر و کافر گر بود — از نہیبِ شہِ دیندار مسلماں شدہ است

می تراشند ز اعضائے بتاں اجزا را — کفر در راستہ بازیچۂ طفلاں شدہ است

رفت توقیع بہ آتش کہ نسوزد جاندار — ہیزم دغارہ خسش راتبہ خواں شدہ است

لاجرم از رہِ اخلاص پے پروانہ — شمع را از ضررِ باد نگہباں شدہ است

روزگاریست گراں مایہ و فرخ کہ جہاں — ہم بداں گونہ کہ بایست بہ انساں شدہ است

شاہِ فرخندہ فرا! خسروِ والا گہرا! — چشمِ بد دور کہ آدم بہ تو نازاں شدہ است

قدر آدم بدلش از تو چناں جائے گرفت
کہ عزازیل ز انکار پریشاں شدہ است

سنگ فرساست چناں نعلِ سمندت کہ براہ
ہر کجا آمدہ، کہسار بیاباں شدہ است

ابر، رخشے ست کہ در زیرِ تو جولاں دارد
برق تیغ ست کہ در دستِ تو عریاں شدہ است

مسندِ روشن نفسے ہست ز آلِ سلجوق
ایں کہ بر مائدۂ فیضِ تو مہماں شدہ است

تو چناں داں کہ غریبے ز دیارِ دہلی
بہ دکن آمدہ از دور، ثنا خواں شدہ است

تیغِ تیز است ثنا گوئے تو، لیکن دانی
جوہرِ تیغ تہِ مورچہ پنہاں شدہ است

نیست جز گردِ دو غبار آنچہ بہر سو نگرم
خواب در دیدۂ من بسکہ پریشاں شدہ است

غنچہ ہست دلِ من ز شگفتن نومید
خود شود سینہ از آں غنچہ کہ پیکاں شدہ است

بہرِ گرمیِ خودم زندہ و بیدل ز انم
کہ دل از فرطِ ریاضت خورشِ جاں شدہ است

غالبِ عمر زدہ درویش و تو درویش نواز
بحلش باد اگر طالبِ احساں شدہ است

صلہ گر می نفرستی، بستائش بنواز
کایں کلامے ست کہ داغِ دلِ حسّاں شدہ است

سخن این است کہ قطعِ نظر از حسنِ کلام
دایہ جوئے سخن سلسلہ جنباں شدہ است

چشم بر لطف و کرم دوختہ را دریاب
کہ ز کاہش بدنش صورتِ مژگاں شدہ است

ایں کہن پیر بہ آوازۂ شیئاً للّٰہ
گدیہ گر بر درِ آں قبلۂ کیہاں شدہ است

در ثنائے تو چہ گفتم، کہ گر آیم بدعا
ایں بدل می سپرم گر بزباں آں شدہ است

باد جاوید گلستانِ ترا فصلِ بہار
اے کہ از فیضِ تو آفاق گلستاں شدہ است[1]

---

[1] سبد باغ دو در بحوالہ مالک رام - آج کل فروری ۱۹۵۹ء

www.taemeernews.com

تشکیل

۱۸۴۱ء میں میرزا غالب کے دیوان اُردو، ۱۸۴۵ء میں کلیات فارسی ۱۸۴۹ء میں پنج آہنگ اور ۱۸۵۴ء میں مہر نیمروز ۱۸۶۱، ۱۸۶۲ء میں دیوان اُردو کی مکرر اشاعت کے ساتھ ساتھ حیدرآباد میں خاص خاص اہلِ ذوق میرزا کے گرویدہ ہو رہے تھے اور یہیں سے حیدرآباد میں دبستانِ غالب کا آغاز ہوتا ہے۔

اس دبستان کے اولین نمائندوں کا ذکر گذشتہ اوراق میں کیا جا چکا ہے جہاں تک دبستان کی تشکیل کا تعلق ہے، ذکا اور سالک کو زیادہ اہمیت حاصل ہے کیونکہ میرزا کے یہ دونوں شاگرد نہ صرف حیدرآبادی تھے بلکہ ایک نے مراسلہ اور دوسرے نے مکالمہ کے ذریعہ میرزا سے ان کے آخری دم تک استفادہ کیا۔ ایک میرزا کی فارسی اور دوسرا میرزا کی اُردو کا وارث ہوا۔ جو بات دونوں میں مشترک ہے وہ یہ کہ دونوں میرزا کے مزاج شناس، معتقد اور دلدادہ

www.taemeernews.com

تھے۔ ان شاگردوں کے علاوہ میرزا کی زندگی کے آخر زمانہ میں یا ان کے انتقال کے بعد میرزا کے دوسرے کئی شاگرد حیدرآباد آئے۔ ان میں سے بعضوں نے یہاں ملازمت کی اور اپنے اپنے وطن لوٹ گئے۔ بعض سیاحت کے لئے آئے بعض اکثر و بیشتر آتے جاتے رہے، اور بعض یہیں کے ہو رہے۔ میرزا کے شاگردوں کی حیدرآباد میں آمد کی غرض کچھ ہی ہو، بحیثیت شاعر، میرزا کے شاگردوں کو ایک نمایاں مقام حاصل رہتا اور یہاں کے ادبی حلقوں میں ان کی قدر ہوتی تھی، حیدرآباد میں میرزا کے شاگردوں کی آمد کا سلسلہ میرزا کے انتقال کے بعد سے شروع ہوتا ہے، اور ان میں سے بعض چراغ ۱۹۲۵ء تک روشنی دیتے ہیں۔ ان شاگردوں میں، سیف الحق ادیب، حکیم معشوق علی خاں جوہر، میر احسن رضا خاں رابط، قاضی محمد عنایت حسین رشکی، ابوالفضل محمد عباس شروانی، تخلص رفعت و سرور نواب شیر زماں خاں تخلص صاحب، سید محمد سلطان عاقل، میر غلام حسنین قدر، وحید الدین خاں بہادر وحید، خواجہ قمرالدین راقم، اور ان کے علاوہ میر مہدی مجروح اور خاص کر خواجہ الطاف حسین حالی قابل ذکر ہیں۔

www.taemeernews.com

یہی وہ ہستیاں ہیں جو حیدرآباد میں دبستان غالب کو تشکیل دیتی ہیں۔

یہاں یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان شاگردوں کا اس حد تک تعارف کرایا جائے جس سے اس کا اندازہ ہو سکے کہ وہ حیدرآباد سے کس طرح وابستہ تھے اور کس زمانے میں ان لوگوں نے یہاں کے ادبی ماحول کو متاثر کیا ہے۔ گذشتہ اوراق میں حیدرآباد کے علمی ماحول اور یہاں کے سلسلہ ہائے تلمذ کا ذکر آچکا ہے۔

اس زمانے کے حیدرآباد میں لکھنؤ سے مصحفی، اسیر، ناسخ، آتش اور دہلی سے شاہ نصیر، ذوق، مومن، میر ذکی اور مدراس سے ثاقب، بنیش، آگاہ، رونق وغیرہ کے سلسلہ ہائے تلمذ سے جدا جدا دبستان قائم تھے۔ ان سارے دبستانوں میں دبستان غالب کے کھلنے سے یہاں کے معیارات فکر و ہنر میں ایک نئی تبدیلی پیدا ہونا شروع ہوئی۔ اس دبستان کو تشکیل دینے والوں کے تعارف کے بعد ان اثرات کا جائزہ لیا جائے گا۔

وحید وحیدالدین احمد خاں بہادر امرائے سلاطین تیموریہ کی اولاد سے تھے۔ ان کے آباواجداد دہلی میں خطاب، جاگیر اور منصب سے سرفراز تھے۔ معتمدالملک حکیم بقا خاں ان کے جد اعلیٰ تھے، وحید کے والد سعدالدین احمد خاں کو عمدۃ الامرا رضیا الدولہ حافظ الملک کا خطاب حاصل تھا

www.taemeernews.com

ظہیر کے بھائی مولوی بشیر الدین احمد خاں، فارسی، عربی کے علاوہ فن طب، علوم طبعیات، ریاضیات، اور الہیات کے علاوہ علوم منطق، فقہ اور حدیث کے بڑے عالم تھے۔ بشیر الدین احمد خاں ۱۸۷۵ء میں حیدرآباد دکن آئے اور ابتداء میں مدرسہ عالیہ میں عربی کے مدرس مقرر ہوئے اس کے بعد سررشتہ بندوبست میں مددگار بندوبست پھر سوم تعلقدار، دوم تعلقدار اور اول تعلقدار ہوئے۔ وہاں سے ترقی پاکر معتمد افواج آصفیہ ہوئے۔ کچھ عرصہ تک مددگار محاسب اور ڈپٹی کمشنر انعام رہے۔ بالآخر مستقل طور پر ناظم نظم جمعیت[1] مقرر ہوئے۔

وحید ۱۸۵۲ء میں دہلی میں پیدا ہوئے اور ۱۸۷۶ء میں اپنے خاندان کے دوسرے افراد کے ساتھ حیدرآباد آئے۔ یہاں تعلقداری کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ بہت کم عمری میں شعر کہنا شروع کیا تھا، میرزا غالب کے شاگرد رہے۔ غالب کے بعد اپنا کلام کسی کو نہیں دکھلایا ۱۹۰۳ء تک بقید حیات اور حیدرآباد ہی میں تھے۔ وحید کی زبان سے حیدرآباد میں جس آہنگ غالب کی گونج تھی اس کا

---

[1] دولت آصفیہ کی افواج بے قاعدہ

www.taemeernews.com

اندازہ ان اشعار سے ہو سکتا ہے۔

سراپا زخم ہوں، صد آفریں اس ناوک افگن کو ہے کیا خاک حیرت ہو گئی ہے چشم سوزن کو
نمودِ خاک سے بھی ہے ہماری خستگی پیدا غبارِ راہ مجنوں جانتے ہیں لوگ مدفن کو
منہ سے ہنوز اُس نے اٹھایا نہ تھا نقاب پامالِ ناز ہو گئے ہم اک ادا کے ساتھ

ہے آرزوئے خاطرِ جاناں عزیز تر
یارب نہ ہو حصولِ تمنا دعا کے ساتھ[1]

عاقل سید محمد سلطان عاقل کے بزرگوں کا وطن برسٹ (ضلع بارہ) تھا لیکن یہ خاندان دہلی منتقل ہو گیا تھا۔ عاقل ۱۳ر مئی ۱۸۵۴ء کو دہلی میں پیدا ہوئے، ددھیال اور ننہیال کے سلسلہ نواب حامد علی خاں بہادر اور نواب نجف علی خاں تک پہونچتے ہیں۔

عاقل کی ابتدائی تعلیم اور نشو و نما دہلی ہی میں ہوئی ہے۔ یہ میرزا کے سب سے کم عمر شاگردوں میں تھے، چند دن بعد عاقل بنارس گئے اور وہاں میر وزیر حسین پھبکت سفید پوش، جو ان کے خالو بھی تھے، سے پھبکتی سیکھی، اور انہیں کی بیٹی سے شادی کی۔

۱۸۸۲ یا ۱۸۸۳ء میں عاقل حیدرآباد آئے، کثیر امراء اُن کے

---

[1] تزک محبوبیہ جلد دوم دفتر دوم ۱۹۰۳ء، مالک رام تلامذۂ غالب

www.taemeernews.com

شاگرد ہو گئے اور ان کی استادی کا شہرہ بلند ہوا۔ حیدرآباد میں ایک عرصہ اخبار ہزار داستاں کے مدیر رہے۔ اس کے بعد خود ہی ایک مطبع قائم کیا اور اخبار آصفی جاری کیا جو بڑے زور و شور سے شائع ہوتا رہا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں شاعری اور صحافت کی وجہ سے حیدرآباد کی ہر مجلس میں ان کا اثر و نفوذ ہو گیا تھا۔ اس کے بعد اخبار آصفی کو خیرباد کہہ کر نواب نظام یار خاں بہادر خانخانان کے کہنے سے ان کے یہاں معتمدی کے عہدہ پر فائز ہوئے۔

۱۴۔ اگست ۱۸۹۱ء کو صرف ۳۹ برس کی عمر میں بعارضہ طاعون انتقال کیا۔ ان کے بعد ان کے بیٹے فرخ سلطان کامل حیدرآباد میں ان کی یادگار باقی ہے۔ عاقل کی وفات کے بعد نواب نظام یار جنگ اور نواب بہرام جنگ نے ان کے بیٹے کامل کی سرپرستی کی۔ عاقل حیدرآباد میں بڑی قدر اور عزت کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے۔ کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو:-

اے شمع یہاں مشقِ گدازش کی ہے گرمی
شعلہ مرے سر کا ہوا کانٹا کفِ پا کا

منظور ہے فنا کو جو مشقِ مصوری
بنتا بگڑ بگڑ کے ہے نقشہ حباب کا

www.taemeernews.com

ٹپکے پسینہ جنکے گنہ بال بال سے
احسان ہے فشارِ زمیں کے عذاب کا[1]

راقم

خواجہ میر قمرالدین خاں راقم کے بزرگ میرزا غالب کے دادا قوقان بیگ خاں کے ساتھ ہندوستان آئے تھے۔ غالب کے دادا اور راقم کے پردادا کے والد دونوں سگے چچازاد بھائی تھے۔ راقم ۱۸۳۲ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ راقم کے والد میرزا بدرالدین خان المخاطب بہ خواجہ امان، بوستان خیال کے مترجم کی حیثیت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔

ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد بہادر شاہ ظفر بادشاہ دہلی کی ملازمت حاصل کرلی۔ اس کے بعد جب حالات بدلے تو یہ ریاست الور چلے گئے لیکن کچھ دنوں بعد پھر دہلی چلے آئے۔ راقم نے کچھ ابتدائی تعلیم بھی میرزا غالب سے حاصل کی۔ اور شاعری میں انہیں کے شاگرد تھے، اپنی زبان پر انہیں بڑا ناز تھا، کہتے ہیں:

ہم زباں سے زبان ہم سے ہے ہر زباں پر فسانہ ہیں ہم لوگ

راقم کی شادی مرزا غالب کے بھانجہ مرزا عاشور بیگ کی صاحبزادی

---

[1] تزک محبوبیہ "تلامذہ غالب"

www.taemeernews.com

سنگی بیگم سے ہوئی تھی، راقم متعدد کتب کے مصنف ہیں جس میں سب سے زیادہ قابل ذکر شرح دیوان غالب ہے۔ ۱۸۷۹ء میں ان کے والد کا انتقال ہوگیا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد راقم حیدرآباد آئے اور دو سال تک سرسالار جنگ کے یہاں امیدواری کرتے رہے، راقم جب حیدرآباد آئے تھے تو شرح دیوان غالب بھی اپنے ساتھ لائے تھے، یہ شرح انہوں نے اپنے بھتیجے نواب ذوالقدر جنگ کے حوالے کی تھی تاکہ شائع کی جائے۔ اس شرح کا نسخہ برسوں گم رہا اور جب ملا تو اس قدر کرم خوردہ تھا کہ اس سے استفادہ مشکل تھا۔ راقم نہایت خوش مزاج اور لطیفہ گو تھے۔ ان کے یہاں ہر وقت علمی مجلس جمع رہا کرتی تھی۔ راقم نے ۱۹۱۰ء میں ۷۸ برس کی عمر میں جے پور میں انتقال کیا۔ نمونہ کلام یہ ہے[1]

دیر ہو، کعبہ ہو، عشرت کدہ کوئی ہو ــــ ہم تو مشتاق نہ ہونگے تیرے گھر کے ہوتے
ہم بھی سنتے ہی رہے، آپ بھی کہتے ہی رہے ــــ روز وعدہ ہی رہے شام و سحر کے ہوتے

ہائے راقم نہ رہے حضرت غالب سر پہ
قدر فرزند کی ہوتی ہے پدر کے ہوتے

---

[1] احوال غالب، مضامین فرحت، تلامذہ غالب

www.taemeernews.com

قدر

سید غلام حسنین قدر ۱۸۳۳ء میں بلگرام میں پیدا ہوئے، قدر بلگرام کے ایک رئیس سید خلف علی بن سید کرامت علی کے بیٹے تھے۔

غلام حسنین ان کا تاریخی نام ہے۔ عربی اور فارسی کے جید عالم تھے شاعری میں دہلی اور لکھنو کے باکمالوں کے شاگرد تھے لکھنو میں سحر اور میرزا فتح الدولہ برق[1] سے فن شعر میں تلمذ حاصل کیا' ان دونوں کے انتقال کے بعد ناسخ کے شاگرد امداد علی بحر سے مشورۂ سخن کیا' غدر کے بعد لکھنو سے بلگرام آئے۔ اتفاقاً اس وقت میرزا غالب کے بھانجے' میرزا عباس بیگ دہلوی بلگرام میں موجود تھے۔ یہیں سے خاندانِ غالب سے قدر کے روابط بڑھے۔ اس کے بعد وہ دہلی منتقل ہو گئے یہیں میرزا غالب سے نظم اور نثر دونوں میں شاگردی اختیار کی۔ جب تک میرزا غالب زندہ رہے استادی اور شاگردی کا سلسلہ جاری رہا ۱۸۸۳ء تک کیننگ کالج لکھنو میں کام کرتے رہے، ۱۸۸۳ میں نواب میر محبوب علی خاں آصف جاہ سادس نمائش دیکھنے کے لئے کلکتہ گئے تو نواب آغا میرزا سرور الملک بہادر کی ایماء پر قدر نے قصیدۂ تہنیت لکھ کر پیش کیا۔ جس پر نہ صرف ان کو صلہ ملا بلکہ نظام اتنے خوش ہوئے کہ انہیں اپنے ساتھ حیدرآباد

---

[1] فتح الدولہ برق واجد علی شاہ کے سبع سیارگان میں شمار کئے جاتے تھے۔

www.taemeernews.com

لے آئے اور چار سو روپے ماہوار مشاہرہ مقرر کیا۔

حیدرآباد میں بہت سے امرا اور شاعر قدر کی شاگردی میں داخل ہوئے۔ حیدرآباد میں قدر کا قیام بہت مختصر رہا لیکن اُس کے اثرات یہاں کے ادبی ماحول پر بہت گہرے پڑے۔ یہاں آنے کے بعد کچھ دنوں بعد قدر بیمار ہو گئے اور علاج کے لئے لکھنو واپس ہوئے۔ ۱۴۔ ستمبر ۱۸۸۴ء کو وہیں لاولد فوت ہوئے۔ جب حضور نظام کو ان کے انتقال کی خبر ملی تو ان کی بیوہ کو دو سو روپے ماہانہ وظیفہ مقرر کر دیا۔ قدر متعدد کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان میں مثنوی قضا و قدر، قوائد العروض، مصطلحات اُردو، عطر مجموعہ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

قدر کا کلیات ۱۸۹۱ء میں آگرہ سے شائع ہوا۔ قدر نے میرزا غالب کی وفات کی تاریخ میں پندرہ اشعار کا ایک ایسا قطعہ لکھا جس میں ہر شعر کے پہلے مصرعہ سے سن عیسوی اور دوسرے مصرعہ سے سن ہجری نکلتی ہے۔ میرزا غالب کے کئی رشتہ داروں، حیدرآباد کے کئی امرا اور غالب کے شاگرد سالک کے بارے میں انکے قطعات تاریخ بھی کلیات میں پائے جاتے ہیں۔ قدر کا رنگ سخن لکھنو اور دہلی کے ایک غیر معمولی امتزاج سے عبارت ہے۔ ان کے

www.taemeernews.com

کلام نے سہل ممتنع کو فروغ دیا۔ یہ رنگ آگے چل کر حیدرآباد میں بہت مقبول ہوا۔ چند شعر نمونتاً پیش کئے جاتے ہیں[1]

خم سے جام شراب نکلا　　کوہسار سے آفتاب نکلا
دوڑو دوڑو کلیم دوڑو　　وہ بام پہ بے نقاب نکلا
اچھا ہوا اور آئینہ دیکھ　　لے گھر میں تیرا جواب نکلا

غنیمت ہے کہ مجھکو لوٹ کر شمار کرتا ہے　　جو سچ پوچھو تو رہزن جانتا ہوں اپنے رہبر کو

مرے زخم جگر اے قدر شکوں ہرے ہونگے
اگر ابر بہاری نے کیا سرسبز گلشن کو

-●-

ادیب محمد سیف الحق ادیب کا سلسلہ نسب شیخ عبدالحق محدث دہلوی تک پہونچتا ہے۔ سیف الحق ادیب ۱۸۴۶ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ علمائے دہلی سے علوم متعارفہ حاصل کئے۔ اصلاح شعر کے لئے غالب کی خدمت میں حاضر ہوئے تو میرزا نے کلام کے محاسن دیکھ کر یہ فرمایا کہ "ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات" ادیب کو صحافت سے بہت دلچسپی تھی دہلی اور لاہور میں بھی مختلف رسالوں

---

[1] "تزک محبوبیہ" کلیات قدر، کارنامہ سروری، تلامذہ غالب

www.taemeernews.com

کی ادارت کے فرائض انجام دیتے رہے۔ وہاں سے طبیعت اچاٹ ہوئی تو حیدرآباد پہونچے، اور ساڑھے چار سو روپے ماہانہ پر پریس رپورٹر مقرر ہوئے۔ داغ جب پہلی مرتبہ ۱۸۸۸ء میں حیدرآباد آئے تو انہی کے یہاں ٹھہرے، اُس وقت ان کا مکان، افضل گنج میں پرانے محبوب گنج کی کمان کے برابر میں تھا۔ اس کا ذکر داغ نے اس طرح کیا ہے:

اُڑاتے ہیں مزے دنیا کے ہم اے داغ گھر بیٹھے
دکن میں اب تو افضل گنج اپنی عیش منزل ہے

اس خاندان کے بہت سے لوگ اب بھی حیدرآباد میں موجود ہیں۔ ۸ ستمبر ۱۸۹۱ء کو پینتالیس سال کی عمر میں دہلی میں انتقال کیا۔ ادیب بہت اچھے مقرر تھے اور جلسوں میں ان کی بہت مانگ رہا کرتی تھی۔ نمونہ کلام درج ذیل ہے۔

جسکو مارا وہ اُف نہیں کرتا ہاتھ ہلکا ہے مرے قاتل کا

مبارک ہو ملتے ہو گر دشمنوں سے
تمہاری یہی نیک نامی کریں گے[1]

---

[1] خم خانۂ جاوید، محبوب الزمن، مرآۃ الحقائق، تلامذہ غالب

www.taemeernews.com

جوہر

حکیم محمد معشوق علی خاں جوہر کے جدِ اعلیٰ روہیلکھنڈ کے بزرگ محمد عمر خاں عرف عمر بابا تھے۔ جن کا مزار اب تک مرجع انام ہے۔ جوہر ۱۸۵۲ء میں شاہجہاں پور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر پائی۔ پھر دہلی اور لکھنو میں طب کی تکمیل کی۔ شاعری میں میرزا غالب کے شاگرد تھے۔ دہرہ دون میں کچھ عرصہ ملازمت کی پھر بھوپال میں وکلاء مختاری کے زمرہ میں شامل رہے۔ نواب بھوپال کے خاندان سے اچھے تعلقات قائم ہو گئے تھے۔ ۱۹۰۸ء میں محمد عزیز میرزا ہوم سکریٹری ان سے علاج کروانے بھوپال گئے اور صحت یاب ہو گئے۔ عزیز میرزا ان کو اپنے ساتھ حیدرآباد لے آئے۔ یہاں پر مہاراجہ کشن پرشاد نے ان کی بڑی قدر کی اور حیدرآباد کے ہائیکورٹ کی سند وکالت بھی عطا کی۔ اس کے بعد جوہر یہیں کے ہو رہے۔ انتقال سے تین سال پہلے شاہجہاں پور گئے اور ۱۹۲۸ء میں وہیں انتقال کیا۔

جوہر حیدرآباد کے مختلف ضلعوں پر بھی رہے اور جہاں رہے وہاں کے ماحول میں شاعری کی محفلیں گرم کیا۔ نمونہ کلام درج ذیل ہے:[1]

شیخ جی ہاتھ تو موقع سے لگے تھے لیکن
کچھ سمجھ بوجھ کے رندوں نے مگر چھوڑ دیا

---

[1] خمخانۂ جاوید، جوہر از میرزا محمد عصمت اللہ بیگ، تلامذہ غالب

www.taemeernews.com

درد منت کش فریاد نہیں ہے جو ہر
ورنہ اوروں کی طرح ہم بھی زبان رکھتے تھے

••

رشکی قاضی محمد حسین رشکی، صدیقی ۱۸- مارچ ۱۲۳۲ء کو بدایون میں پیدا ہوئے فارسی اپنے والد اور عربی قاضی عبدالسلام سے پڑھی۔ شعر میں میرزا غالب سے اصلاح لی۔ پہلے بدایون میں سررشتہ دار عدالت رہے پھر ٹونک میں محمد علی خاں رئیس کے مصاحب ہو گئے اس کے بعد خواجہ اور جودھپور میں ملازمت کی بالآخر حیدرآباد میں آکر رہے ۱۹۰۸ء میں جب موسیٰ ندی میں طغیانی آئی تو ان کا گھر بارندر سیلاب ہو گیا اور اسی میں ان کا کلام بھی ضائع ہو گیا۔ ۱۴- نومبر ۱۹۱۸ء میں بدایون میں انتقال کیا۔ نمونہ کلام یہ ہے[1]:

وہ آئیں پس از مرگ امید کیا ہے ہم اپنے نصیب آزمائے ہوئے ہیں
یہ مانا ہم نہ کریں شکوۂ ستم لیکن خدا کے سامنے ہونا کبھی حساب بھی ہے

مٹے جو الفت خیر الوریٰ میں
ہمیں ایسا کہیں دیدے خدا دل

---

[1] مالک رام، تلامذۂ غالب

www.taemeernews.com

ان کے علاوہ میرزا کے شاگرد احسن رضا خاں رابطؔ دہلوی سے حیدرآباد کے بعض ممتاز شعراء کو تلمذ رہا ہے۔ مولوی نادر علی برترؔ غازی پوری جو حیدرآباد میں رسالہ نسیم دکن کے مدیر اور دبستان غالب کے ایک اہم رکن تھے انہیں رابطؔ ہی سے تلمذ تھا۔ رابطؔ حیدرآباد میں کب رہے اس کا پتہ نہیں ملتا' وہ بالعموم دربھنگہ میں رہتے تھے[1]

تلامذۂ غالب کے حیدرآبادی شاگردوں کی مکمل فہرست بہت طویل ہوگی۔ یہاں ایسے چند شاگردوں کے نام دیئے جاتے ہیں جن سے دبستانِ غالب کی تشکیل ہوئی ہے۔

میرزا قربان علی بیگ سالکؔ کے شاگردوں میں' حافظ ابوالحسن محمد داؤد ہادیؔ، محمد سلیمان مہدیؔ، محمد امداد حسین عازمؔ قابل ذکر ہیں۔ میر محمد علی بخشیؔ، سالکؔ اور برترؔ دونوں کے شاگرد تھے۔ غلام محمد عربؔ شوقؔ، عاقلؔ کے شاگرد تھے۔ ابوالمعارج میر عبدالرؤف شوقؔ، قدرؔ کے، میرزا محمد عصمت اللہ بیگ، جوہرؔ کے اور رائے جانکی پت پرشاد، مطیرؔ، برترؔ کے شاگرد رہے ہیں[2]۔

---

[1] تزک محبوبیہ، نادرات غالب

[2] تزک محبوبیہ

www.taemeernews.com

اثرات

مرزا غالب کا اسلوب سخن صرف اسالیب فن ہی کو متاثر نہیں کرتا ہے بلکہ طرز فکر کو بھی متاثر کرتا ہے اس میں شک نہیں کہ غالب کی اتباع ان کے معیار فکر و تخیل کے پیش نظر کوئی سہل کام نہیں ہے تاہم اُن کے اسلوب میں یہ توانائی ہے کہ بقول ڈاکٹر سید عبداللطیف' اُن کا کلام سن کر وہ لوگ بھی متاثر ہوتے اور لطف اٹھاتے ہیں جو اُس کے معنی کی گہرائیوں تک نہیں پہونچ سکتے، یہی حال غالب کی اتباع میں بعد کے شعرا کا ہوا کہ وہ میرزا کے فکر و فن کی اگرچہ ہوا بھی نہیں پا سکتے لیکن ان کی زمینوں میں غزلیں کہتے ہیں، ان کی تراکیب سے استفادہ کرتے ہیں ان کی تعقیدات کو ہنر کے طور پر اختیار کرتے ہیں۔ ان کے لہجہ کو اپناتے ہیں' اور انکی طرز گفتار کی نحوی در و بست سے اپنے کلام کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرتے ہیں' میرزا

www.taemeernews.com

مستقبل کے نقیب اور مستقبل کے شاعر تھے۔ ان کے طرزِ فکر اور طریقہ استدلال میں علمی استواری ہے۔ جن ہوشمند شاعروں نے مستقبل نہ سہی اپنے زمانے کی روش کو سمجھا اور زندگی کے نئے تجربوں کی قدر و قیمت کو پہچانا وہ ہندوستان کے کسی علاقے کے کیوں نہ ہوں اسلوب کے نقطۂ نظر سے وہ خود بخود دبستان غالب کی طرف کھنچتے آئے۔ یہاں تک کے نئے زمانے کی شاعری کا اسلوب بنیادی طور پر اسلوب غالب ہے۔ حیدرآباد اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ فکر غالب نے حیات و کائنات کی حقیقتوں کو سمجھنے اور اُن کو موضوعِ سخن بنانے کے امکانات کو بعد کی نسلوں پر خوب ہی روشن کیا۔ جب کوئی شاعر زندگی کے نئے تجربوں سے روشناس ہوسکا اور اس نے روایت سے گریز کی ضرورت محسوس کی تو اُسے اسلوبِ غالب ہی سے، پیرایہ غالب ملا ــــ غالب کے بعد کے ہر دور کے حیدرآبادی شاعر کے یہاں خواہ وہ اس سلسلہ تلمذ سے وابستہ رہا ہو یا نہ رہا ہو اگر زندگی اور فکر کی کہیں رمق ملتی ہے تو وہ اسلوب غالب ہی میں ملتی ہے۔ غالب کی مشکل گوئی اور فکر انگیزی ہی سے ان کی شخصیت کا تصور مرتب ہوتا تھا چنانچہ حکیمانہ شاعری اور اسلوب غالب بعد کی نسلوں کے تصور میں کچھ لازم و

www.taemeernews.com

ملزوم ہو گئے۔ نئے زمانے میں شاعری کی روایاتی مضامین کی دلکشی باقی نہیں رہی اگر کسی شاعر کو جہاں شعر میں آفتاب تازہ پیدا کرنے کی آرزو ہوتی تو اس کے ذہن میں غالب ایک آئیڈیل کی شکل میں ابھرتا یہاں پہونچکر شاعر کو اپنی بضاعت کا اندازہ ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ غالب کے بہت سے شاگرد ان کے معیار سخن سے کوئی قابل لحاظ قربت حاصل نہ کر سکے لیکن بعض دوسرے شعراء جو اگرچہ تلمذ کے ان سلسلوں سے وابستہ نہیں تھے انہوں نے اسلوب غالب کو اپنانے میں قابل لحاظ حد تک کامیابی حاصل کی۔ ایسی کوششیں تقریباً ہر شاعر کے یہاں اس کی شعری زندگی کے چند لمحات میں ضرور ملتی ہیں۔ یہ کوششیں چند ہی صورتوں میں توانا ہیں لیکن اکثر نہایت مضمحل ہیں۔ بہرحال ان تشکیلی عوامل کے زیر اثر، جن پر گفتگو کی جا چکی ہے ذی شعور طبقہ میں مثالی شاعر کا تصور صرف میرزا غالب کی ذات سے وابستہ تھا۔

حیدرآباد کے شعراء میں گذشتہ ایک صدی میں دبستان غالب کے اتباع کی جو کوششیں کی گئی اس کے جائزہ کے لئے ایک سفینہ چاہیے اس دور کے حیدرآبادی شاعروں میں احمد حسین مائل

www.taemeernews.com

رضی الدین حسن کیفی، جلال الدین توفیق، کشن پرشاد شاد، عزیز یار جنگ عزیز، میر قادر حسین فرق، امداد حسین عازم، میر مہدی حسین الم، سید نواز حسن علی لمعہ، اعظم علی شایق، وحید الدین عالی، احتشام الدین تجلی، عبدالحی یازغ، عبدالولی فروغ، عبدالعلی طیش مولانا عبدالقدیر حسرت، اور احمد اللہ واصل کے علاوہ جو شعرا شمالی ہند سے یہاں آکر یہیں کے ہو رہے مثلاً:

حبیب کنتوری، سید حیدر علی نظم طباطبائی، شمس الحق میکش تھانوی، فصیح الملک داغ دہلوی، نواب مرزا شکیب دہلوی، عبدالرحمن بیدل سہارنپوری، نادر علی برتر قنوجی، نجم الدین ثاقب بدایونی، سید محمد ضامن کنتوری، ابوالحمید آزاد دہلوی، منیر الدین ضیا دہلوی، مرزا بہادر یاور، اصغر یار جنگ اصغر[1]

اگرچہ دہلی لکھنو اور جنوبی ہند کے مختلف دبستانوں سے تعلق رکھتے تھے لیکن ان سب کے یہاں اسلوب غالب کی اتباع کے نہایت دلکش اور کامیاب نمونے ملتے ہیں۔ اگر ان شعرا کے یہاں سے اسلوب غالب کے اقتباسات پیش کیے جائیں تو

---

[1] مرقع سخن

www.taemeernews.com

دلبستان غالب کا ایک ضخیم مرقع تیار ہو سکتا ہے۔

حیدرآبادی شاعر جلال الدین توفیق غالب کی اتباع کی وجہ سے بہت مشہور ہوئے۔ توفیق کے زمانہ اور اس اسلوب میں ان کی کامیابی کے پیش نظر انہیں حیدرآباد میں دلبستانِ غالب کے نمائندہ کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ توفیق کا اگرچہ ایک انفرادی رنگ بھی تھا' اور انہوں نے غالب کے علاوہ مومن کی بھی اتباع کی ہے لیکن جس بات نے انہیں اپنے معاصرین میں ممتاز کیا وہ اُن کی اتباعِ غالب تھی۔

سید جلال الدین توفیقی سادات فرقہ مہدویہ سے تھے ۱۲۸۱ھ (م ۶۵-۱۸۶۴ء) میں حیدرآباد میں پیدا ہوئے ان کے والد سید ابراہیم تصدیق نہایت پرگو شاعر تھے۔ ایک مہدوی فقیر کی حیثیت سے توفیق کی شاعرانہ زندگی ستائش وصلہ سے ہمیشہ مستغنی رہی۔ انہوں نے عربی، فارسی علوم دینی، منطق، رمل، طب اور فن خطاطی میں علماء اور ماہرین وقت سے استفادہ کیا اور ان علوم و فنون میں دستگاہ حاصل کی۔

توفیق کا انتقال ۱۹۲۱ء میں حیدرآباد میں ہوا۔ توفیق کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر عبدالقادر سروری نے دلبستانِ غالب

www.taemeernews.com

کی تشکیل اور اثرات کے تعلق سے بڑے پتہ کی باتیں کہی ہیں:

"بعد کے شعراء کے لئے خصوصاً غالب نے معاصرین کے طعن و تشنیع کو برداشت کرکر کے راستہ صاف کر دیا تھا....."

"توفیق کی طبیعت کا یہ ایک تقاضا تھا کہ وہ غالب کی طرح ہر جگہ پامال اسالیب سے بچنے کی حتی الامکان کوشش کرتے ہیں۔ ان کے دیوان کا مطالعہ کرنے والا اس چیز کو خاص طور پر محسوس کرتا ہے، اس رجحانِ طبع کے سبب قدیم دبستان کے شاعر کا راستہ بہت کٹھن ہو جاتا ہے....."

"توفیق کے نئے اسالیب دراصل خیال آفرینی کے سلسلہ میں پیدا ہوئے ہیں۔ خیال آفرینی توفیق کی ممتاز خصوصیت ہے..... یہ روش انہیں اس قدر مرغوب تھی کہ وہ بغیر کاوش کے بہت کم شعر سرانجام کرتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ بعد میں یہ راہ ان کے لئے آسان ہو گئی تھی، لیکن ابتدا میں غالب کی طرح انہیں بھی دور سے مضامین پکڑ لانے کی ضرورت پڑتی تھی۔"[1]

---

[1] مرقع سخن صفحہ ۲۴۵ تا ۲۵۶، ادارۂ ادبیات اُردو، ۱۹۳۵ء

www.taemeernews.com

اتباع غالب میں کہے ہوئے توفیق کے کلام کی شہرت اُن کی زندگی ہی میں ملک کے طول و عرض میں پھیل چکی تھی۔ چنانچہ مولانا حالی ۱۹۰۵ء میں جب حیدرآباد آئے تو توفیق سے بڑے اشتیاق کے ساتھ ملے[1] اور ان کا کلام سن کر کہا کہ "استاد مرحوم زندہ ہوتے تو آپ کے کلام کی خوب داد دیتے[2]"۔ ظاہر ہے استاد مرحوم سے میرزا غالب ہی مراد تھے۔

یہاں غالب اور توفیق کے چند ایسے اشعار پیش کیے جاتے ہیں جن سے یہ معلوم ہو سکے کہ توفیق پر غالب کا رنگ کس قدر غالب تھا:

افسردگی نہیں طرب انشائے التفات — یاں درد بن کے دل میں مگر جا کرے کوئی
(غالب)

دعویٰ ہے حسن کا تو ذرا بے حجاب ہو — بن کر شرار سنگ میں کیوں جا کرے کوئی
(توفیق)

بسکہ روکا میں نے اور سینہ میں اُبھریں پے بہ پے — میری آنکھیں بخیۂ چاک گریباں ہو گئیں
(غالب)

کی دفورِ ناتوانی نے تلاش چاک کی — جھک گئیں آنکھیں تو پیوند گریباں ہو گئیں
(توفیق)

اُگ رہا ہے در و دیوار سے سبزہ غالب — ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے
(غالب)

دیکھ تو چل کے شہیدانِ وفا کا عالم — خون زخموں سے نکلتا ہے بہار آئی ہے
(توفیق)

۱۹۱۱ء جامعہ عثمانیہ کے قیام کے بعد حیدرآباد کی ادبی زندگی میں جو

---

[1] عبدالرزاق راشدؔ، مقدمہ فغانِ خیال ص۱۱، مطبوعہ ۱۹۳۶ء

[2] ایضاً ص۲۲

www.taemeernews.com

تبدیلیاں آئیں وہ دبستان غالب کے فروغ کے لئے نہایت سازگار تھیں۔ یوں تو غالب کا دیوان اُردو اور ان کی فارسی نثر یہاں کے اداروں میں جامعہ عثمانیہ کے قیام سے پہلے ہی داخل نصاب تھے، غالب کے دیوان اُردو کو جامعاتی سطح پر داخل نصاب کرنے کی اولیت کا سہرا غالباً مدراس یونیورسٹی کے سر جاتا ہے۔ ۱۸۸۱ء میں ڈاکٹر اگھورناتھ چٹوپادھیائے نے حیدرآباد میں نظام کالج قایم کیا جو ڈگری کالج تھا اور اس کا الحاق مدراس یونیورسٹی سے تھا۔ نظام کالج کے انٹرمیڈیٹ اور بی۔اے کے درجوں میں غالب کا اردو دیوان شامل نصاب تھا۔ تدریس غالب کے لئے عبدالعلی والہ اور علی حیدر نظم طباطبائی جیسے ماہرین غالب کا تقرر کیا گیا تھا۔

۱۸۵۶ء میں مدرسہ دارالعلوم قائم ہوا تھا اس میں کچھ عرصہ کے بعد پنج آہنگ کا آہنگ پنجم جزوی طور پر نصاب میں شامل تھا اسی لئے ۱۳۳۸ھ میں پنج آہنگ مطبع انوارالاسلام حیدرآباد دکن کی جانب سے بھی شائع کیا گیا تھا۔ مدرسہ دارالعلوم میں مولوی سید اشرف شمسی فارسی کے استاد تھے۔

جامعہ عثمانیہ کا نہ صرف ذریعہ تعلیم اردو تھا بلکہ اس کے شعبوں میں شعبہ اردو سب سے پہلے کھلا اور اس وقت یہ ایک وسیع شعبہ تھا۔ جامعہ

www.taemeernews.com

عثمانیہ میں ڈاکٹر عبدالستار صدیقی اور مولوی وحیدالدین سلیم جیسے اساتذہ نے نئی نسلوں کو غالب کے فکر ونظر سے روشناس کرایا۔ شعبۂ اردو کے علاوہ جامعہ عثمانیہ نے ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، بابائے اُردو مولوی عبدالحق، نواب صدر یار جنگ، ڈاکٹر رضی الدین اور ڈاکٹر یوسف حسین خاں، جیسے دلدادگانِ غالب نے حیدرآباد کے علمی حلقوں میں غالبیات کو ایک اہم موضوع سخن بنائے رکھا۔

دبستان غالب کے اثرات صرف شاعری تک محدود نہیں رہے۔ میرزا کی نثر نے بھی یہاں کے ماحول کو متاثر کیا۔ اردو معلی اور عود ہندی کے منتخبات ہر سطح پر داخل نصاب تھے۔ تاہم نثر غالب کی اتباع صرف زبان دانی نہیں بلکہ تخصیت کی بھی مقتضی تھی۔ مہاراجہ کشن پرشاد کی شخصیت اور زبان دانی غالب سے ان کے والہانہ لگاؤ کے زیر اثر ایک ایسے اسلوب نثر کو تشکیل دیتی ہے جو مرزا کے اسلوب نثر کی نہایت کامیاب پیروی کہی جاسکتی ہے۔

مہاراجہ کشن پرشاد راجہ چندولال کے اخلاف میں ہیں۔ دولت آصفیہ میں پیشکاری اور مدارالمہامی کے عہدوں پر فائز رہے۔ مہاراجہ کشن پرشاد اردو، فارسی، انگریزی، سنسکرت اور عربی سے

www.taemeernews.com

اچھی طرح واقف تھے، نہایت خوش گو شاعر تھے اور شادؔ تخلص کرتے تھے۔ شاد جنوری ۱۸۶۴ء میں حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ شعر و ادب میں رتن ناتھ سرشار اور نظم طباطبائی جیسے اساتذہ سے مشورہ کیا۔ شاد کے روابط مولانا حالیؔ اقبال اور ملک کے صفحۂ اول کے مشاہیر سے نہایت دوستانہ اور مخلصانہ تھے۔ شاد نے ۱۲۔ مئی ۱۹۴۰ء کو انتقال کیا۔

شاد نے مکتوب نگاری میں میرزا غالبؔ کی پیروی کی ہے۔ ان کو میرزا غالب سے جو والہانہ عقیدت تھی اس کا اندازہ مولانا حالیؔ کے نام ان کے اس مکتوب سے کیا جا سکتا ہے:

"اور اپنا دلی اظہار کرتا ہوں کہ میں متقدمین میں حضرت سعدی علیہ الرحمہ، اور متاخرین میں میرزا غالب مرحوم، ان دونوں کے دلچسپ اور بیش بہا کلام کا دالہ و شیدا ہوں۔

"اب سنیے کہ جس حالت میں آپ کو اور مجھے غالب مرحوم کے کلام کے ساتھ ایک دلی تعلق اور اسی دلی تعلق کی بدولت آپ کے دلچسپ تالیفات نے مجھے اس بیگانگی میں بے تکلف کر دیا تو یہ ذریعہ تعارف پیدا کرنے کے لیے بالکل کافی ہے۔

کاش ابھی غالب مرحوم نہ مرتے یا ان کی حیات میں مَیں ذلیشعور

www.taemeernews.com

ہوتا ہے ؎

زندہ جو کہیں ہوتے ابھی حضرتِ غالب
اے شاد ترے دل کی تمنا بھی بر آتی

خدا بخشے اگر مرحوم زندہ ہوتے تو میں اپنا حرزِ جان کرتا۔ ع

کجا بود مرکب کجا تا ختم [1]

شاد نے حالی کے نام یہ خط ۱۸۹۹ء سے پہلے لکھا ہے اور ان سے یہ فرمائش کی ہے کہ میرزا کی یا میرزا پر جب کبھی کوئی چیز شائع ہو اس کا ایک نسخہ فی الفور شاد کے یہاں بھیجا جائے۔

نثر میں شاد نے غالب کی اتباع شعوری طور پر کی ہے۔ کسی نے اُن پر یہ الزام لگایا تھا کہ وہ اپنی نظم و نثر پنڈت رتن ناتھ سرشار سے لکھوا لیا کرتے تھے۔ اس پر وہ اپنے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

"پنڈت رتن ناتھ سرشار لکھنوی کا نام میں نے اس وجہ سے نہیں لکھا کہ میرے ہاں موجود ہیں۔ یا بقول آپ کے دوست کے وہ مجھے نظم و نثر لکھ دیا کرتے ہیں۔ نہیں نہیں، ان سے پوچھ لیا جائے کہ جب وہ حیدرآباد آئے تو اس وقت میری

---

[1] رقعات شاد ص ۳۶، مطبوعہ ۱۳۱۷ھ

www.taemeernews.com

اردو زبان کیسی تھی اور ان کا میری نسبت کیا خیال تھا۔ الغرض

میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں۔ مگر بھیّا! معمولی مکتوب
نویسی وغیرہ میں اگر غالب مرحوم کا چربہ نہ اتارا ہو تو ہار جاؤں"[1]

"رقعات شاد" اسلوب غالب کی اتباع کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ شاد کے رقعات کا پہلا مجموعہ ۱۸۹۹ء میں شائع ہوا ہے عود ہندی ۱۸۶۸ء اور اردوئے معلّٰی ۱۸۶۹ء میں چھپی، اس وقت شاد کی عمر پانچ چھ برس کی تھی۔ اسلوب غالب میں شاد کے رقعات عود ہندی اور اردوئے معلّٰی کی اشاعت کے تیس برس کے اندر ہی شائع ہوئے ہیں۔ گویا شاد آغاز شعور ہی سے غالب سے متاثر ہوئے ہیں اور ان کے اتباع کی دھن میں لگ گئے ہیں۔ مکتوبات شاد کے زیادہ اقتباسات دینے کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔ یہاں ایک رقعہ نقل کیا جاتا ہے۔

شفیق و مشفق،

آپ کا اتحاد نامہ پہونچا۔ عبارت آرائی ہے یا سحر حلال، مضمون طرازی ہے یا جادوگری، ہر ہر فقرہ پہلودار، مضمون دلکش، معنی دلفریب، سبحان اللہ عجیب طبیعت پائی ہے۔ جی خوش ہوگیا۔
بندہ آزاد، شاد

---

[1] رقعات شاد
[2] ایضاً ص ۱۲۹

www.taemeernews.com

غالبیات

● انتقادیات ● غالب کی شرحیں ● شذرات

انتقادیات

(۱)

غالبیات کا آغاز حیدرآباد سے ہوا۔ غالب کی نظم ونثر اُردو وفارسی پر جس شخص نے سب سے پہلے قلم اٹھایا اُس پر غالب سے مہر تصدیق لی اور چھاپ کر اس کو شائع کیا' وہ حبیب اللہ ذکا ہیں۔ ذکا کا یہ معمول تھا کہ جب وہ غالب کی کوئی تصنیف پڑھتے یا نقل کرتے تو اس تصنیف پر اپنی رائے لکھ دیتے، انہوں نے "خاش وخماش" کے نام سے اپنا مختصر سا مجموعہ نظم ونثر مرتب کیا ہے جس کا پہلا حصہ مکتوبات، دوسرا حصہ متفرقات، تیسرا منظومات پر مشتمل ہے، 'خاش وخماش' کے حصہ متفرقات میں ذکا نے وہ سارے تبصرے شامل کر دیئے ہیں جو انہوں نے میرزا کی نظم ونثر کے مختلف مجموعوں کے بارے میں لکھے تھے۔ خاش وخماش کی تقریظ خود میرزا غالب نے

www.taemeernews.com

لکھی تھی اور اپنی ۱۲۷۸ھ والی مہر ثبت کی تھی۔ لیکن یہ مجموعہ ذکا کی وفات کے بعد میرزا کے ایک اور شاگرد سید محمد سلطان عاقل دہلوی، جو حیدرآباد کے اخبار آصفی کے مدیر تھے، کے اہتمام سے حیدرآباد میں چھپا۔ عاقل خاش وخماش کے شائع کرنے میں جو فخر محسوس کرتے ہیں، اس کا اظہار انہوں نے ان الفاظ میں کیا ہے:

"میری سوانحعمری میں یہ کام، جو علمی مذاق کی مستند سند ہے میرے ہاتھ سے ہوا، البتہ ایک چمکتی ہوئی علامت میری تابندہ اختری کی ہے..... اے پروردگار منشی محمد حبیب اللہ صاحب ذکا مرحوم کو درجہ اعلیٰ عطا فرما کہ جن کی روح کی برکت سے یہ فخر مجھ کو حاصل ہوا اور ان کے صاحبزادے مولوی محمد میراں صاحب کو خوش رکھ، جن کے باعث عاقل بخت نام آوری کی رسائی میں کامل ہوا"[1]

ذکا کے تبصرہ سے ظاہر بات ہے کہ عشق وعقیدت میں ڈوبے ہوئے ہیں، خاش وخماش ایک فارسی کتاب ہے اور یہ تبصرے

---

[1] خاش وخماش ص ۲۸۲

www.taemeernews.com

بھی فارسی میں ہیں، یہاں ان تبصروں سے خال خال نکات نمونتاً پیش کیے جاتے ہیں۔

دستنبو پر تبصرہ : "اللہ اللہ جیبائے ذکا کا قلم بھی اعصائے موسیٰ کا ثانی اور اس کا ہاتھ ید بیضا کا نائب ہے لیکن دستنبو کے مقابلہ میں اس کی حیثیت کاغذ تو تیا پر سحر سامری کی سی ہے۔ غلط نہیں کہتا ہوں اور غلط نہیں ہے ظہوری نظیری نے پیش بینی سے اپنا حصہ اٹھا لیا اور اس زمانے کے پہنچنے تک مردہ ہو چکے ہیں گویا انہوں نے اپنا منہ چھپا لیا ہے۔"

مہر نیمروز پر تبصرہ : یہ استاد معنوی اسد اللہ خاں دہلوی کا طلسمی راستہ ہے۔ اس نسخہ کی عبارت نے میری قوت مطالعہ کی تشنگی بڑھا دی۔ اگر صاف پوچھو تو میں نے نفع اسی میں پایا کہ اسے نقل کر لیا جائے تاکہ کسی حرف سے سرسری نہ گذر جاؤں اور کوئی نکتہ میری نظروں سے چوک نہ جائے۔

انتخاب اشعار اردو پر تبصرہ : حبیب اللہ نامہ سیاہ نے اپنے تجربے اور عمل کے اندازے سے اور موقع و محل کے لحاظ سے چند شعر استاد معنوی اسد اللہ خاں دہلوی کے دیوان سے چن لئے ہیں اور اپنی خلوت میں ان کو ندیم راز دار اور جلوت میں اپنا حکیم آموزگار سمجھ

www.taemeernews.com

رکھاہے۔ کہیں یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ تھوڑے سے اشعار پسند کر لیے اور بہت سے چھوڑ دیئے۔ اللہ اللہ! کوئی زاہد کم فرصت نماز پنجگانہ کے لئے اگر کوئی پانچ سورتیں چن لے تو اس میں قرآن کا کیا گناہ ہے اگر کوئی صدف اپنی تنگ ظرفی سے چند قطروں میں سیراب ہو جائے تو ابر نیساں کا کیا قصور؟

دیوان اردو پر تبصرہ: اس کتاب کے مطالعہ نے کہ اس کے صفحات اور اوراق علاج اور مداوا[1] کے کہ ہم عدد ہیں۔ میرے لئے نوشدارو کا ایک تسکین بخش نسخہ فراہم کیا ہے۔ اس کے بعد میں نے شیخ امام بخش ناسخ اور خواجہ حیدر علی آتش کے دیوان طاق نسیاں پر رکھ دیئے۔

(۲)

کلام غالب کے رموز و دقائق اور ان کی فارسی دانی پر حیدرآباد کے علماء میں بھی بحثیں رہی ہیں۔ اس وقت حیدرآباد میں سید علی طوبیٰ شوستری[2] فارسی کے جلیل القدر عالم تھے۔ غالبیات کے

---

[1] علاج کے اعداد (۱۰۴) اور مداوا کے اعداد (۱۰۵) ہوتے ہیں گویا جملہ ۲۰۹ صفحات ہیں۔

[2] پیدائش ۱۸۳ء وفات ۱۹۰۶ء

www.taemeernews.com

ایک ماہر عبدالعلی[1] والہ نے طوبیٰ شوستری کو ایک خط لکھا اور غالب کے تین فارسی اشعار نقل کر کے اور انہیں قسم دے کر پوچھا کہ تینوں اشعار سقیم ہیں یا نہیں[2]۔ اس خط میں والہ نے غالب پر یہ اعتراض کیا ہے کہ وہ عربی اور ترکی الفاظ سے اجتناب کرتے ہیں اور پہلوی الفاظ کثرت سے استعمال کرتے ہیں۔ اس مکتوب کے حاشیہ میں والہ کے فرزند محمد عبدالواجد لکھتے ہیں کہ اس زمانے میں حیدرآباد میں غالب کے شاگرد اور پیرو حیدرآباد میں وارد تھے اور مسائل غالب پر والہ سے مقابلے، مباحثے اور مناظرے ہوتے تھے۔ یہ واقعات ۱۸۹۵ء سے پہلے کے ہیں۔

اس بارے میں طوبیٰ کی رائے ہمیں نہیں مل سکی لیکن یہ واقعہ[3] غالبیات کے ارتقا میں محلِ نظر ہے۔

---

[1] پیدائش ۱۸۳۲ء، وفات ۱۸۹۳ء

[2] وہ تین شعر یہ ہیں:

مغنی دگر زخمہ بر تار زن ÷ گل از نغمہ تر بدستار زن

من کہ با ساقی زلالی قرعہ با یدم ÷ آفتاب آسا بزور خوش گرد و ساغرم

در رہگذر بہ پرستش ناگرکشی چہ باک ÷ آخر شراب نیست عنان سمند تو

[3] عبدالعلی والہ گلستان نظم حصہ دوم ص ۲۴ مطبع عزیز دکن حیدرآباد ۱۳۱۲ھ

www.taemeernews.com

(۳)

ان اشارات سے حیدرآباد میں غالبیات کے ارتقار کے بعض پہلوؤں کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ۱۹۲۰ء تک غالب کی مخالفت میں جو کچھ کہا گیا وہ بالعموم ان کی فارسی دانی کے بارے میں تھا لیکن ان ناقدین نے غالب کی عظمت سے کبھی انکار نہیں کیا۔ انہیں جہاں تہاں میرزا کے چند لسانی ارتکابات کی حد تک ہی شکایت تھی۔ یہ دور پورے ہندوستان میں غالب کی مقبولیت کا دور ہے۔ حیدرآباد میں جہاں شخصی حکومت تھی وہاں شخصی قدردانی اور شخصیت پرستی کا ہونا فطری تھا۔ ۱۹۲۸ء تک غالب پرستی ایک خطرناک شکل اختیار کر چکی تھی۔ نئی نسلیں یہ سمجھنے لگی تھیں کہ انسان غالب سے آگے نہیں سوچ سکتا۔ ۱۹۲۱ میں ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کے مقدمہ نسخہ حمیدیہ نے اس عقیدت کو اس حکم سے اور تیز کر دیا کہ ہندوستان میں دو ہی الہامی کتابیں ہیں وید مقدس اور دیوان غالب ـــــ ڈاکٹر سید عبداللطیف نے غالب سے بڑھتی ہوئی عقیدت اور غالب کے حیات و کارناموں سے لوگوں کی بالعموم عدم واقفیت سے پیدا ہونے والے نقصانات کو سمجھا۔

www.taemeernews.com

(۴)

ڈاکٹر لطیف نے ۱۹۲۸ء میں "غالب۔ حیات اور اردو شاعری کی تنقیدی تحسین"۔ کے نام سے انگریزی میں ایک کتاب لکھی۔ یہ مختصر سی کتاب جذبے کے اندھوں اور تحقیق کی آنکھ رکھنے والوں کے لئے ایک پیغام انقلاب تھی۔ اس کتاب کے دو مختلف پہلو ہیں، اس کا ایک پہلو جذباتی فضا کا ردعمل ہے، یہ بڑا تلخ اور درشت ہے اس میں ڈاکٹر لطیف نے غالب کے بعض ایسے اشعار پر تکلیف دہ تنقید کی ہے جو عوام میں بے حد مقبول تھے۔ مثلاً غالب کے یہ مشہور اشعار:

رہیے اب ایسی جگہ چل کے جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو

بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیئے
کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو

پڑیئے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیماردار
اور اگر مر جایئے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

پر یہ تنقید کی کہ یہ غالب کی انتہائی پرواز کا ماحصل ہے اور یہ ایک دیوانہ کی بہشت ہے۔ ڈاکٹر لطیف کی کتاب میں ایسی تلخ تنقید

www.taemeernews.com

کی کئی مثالیں مل جائیں گی۔ اب کم وبیش چار دہے گذر جانے کے بعد مجھے ڈاکٹر لطیف سے یہ پوچھنے کا موقع ملا کہ انہوں نے ایسا کیوں کہا تھا۔ ڈاکٹر لطیف نے غالب سے عقیدت مندی کے اُن حالات کا تذکرہ کرتے ہوئے جو کتاب کی تصنیف کے وقت عام طور پر سارے ملک میں اور خاص طور پر حیدرآباد میں چھائے ہوئے تھے یہ کہا کہ "یہ تنقید دراصل اُس شدت کو کم کرنے کے لئے تھی اور نئی نسلوں کو اس قابل بنانا تھا کہ وہ ماضی کی عظمت سے مرعوب ومغلوب نہ ہوں بلکہ اس کے مقابل ٹھہر کر اس کے حسن اور اس کی عظمتوں کا صحیح محاسبہ کر سکیں اور اپنی مستقبل آفریں صلاحیتوں کو سلامت رکھ سکیں"۔ ڈاکٹر لطیف کی تصنیف کا دوسرا پہلو فکری اور تحقیقی ہے۔ اس کتاب کا یہی پہلو ہے جس سے مطالعۂ غالب کو ایک سائنٹیفک کردار ملا اور ڈاکٹر لطیف کی بتلائی ہوئی رہگزر پر ماہرینِ غالبیات کا کاروان چل پڑا۔

ڈاکٹر لطیف نے اس مختصر سے مطالعہ میں غالب کی شخصیت کے نشوونما کے عہد وا دوار متعین کئے جو آج غالب شناسوں کے لئے محکمات میں شامل ہیں۔ ڈاکٹر لطیف نے غالب کے

www.taemeernews.com

اردو مکاتیب اور اُردو کلام کی تاریخی ترتیب کا عظیم کارنامہ انجام دیا۔ انہوں نے غالب کا ایک دیوان تاریخی ترتیب کے ساتھ مرتب کیا تھا جو اشاعت کے وقت پریس میں آگ لگ جانے کی وجہ سے تلف ہوگیا۔ تاہم اس کام کے لئے ڈاکٹر لطیف نے جو اصول اور قواعد بنائے تھے ان سے استفادہ کرتے ہوئے ان کے دوست، مولانا امتیاز علی عرشی نے، تاریخی ترتیب کے ساتھ غالب کا سارا اردو کلام مرتب کرکے شائع کر دیا ہے جو نسخہ عرشی کے نام سے مشہور ہے۔

ڈاکٹر لطیف کی اس تصنیف کے دو حصے نہایت اہم ہیں۔ ایک وہ جس میں انہوں نے مسائل غالب کا جائزہ لیا ہے اور دوسرے وہ جس میں انہوں نے غالب کے "زاویہ نگاہ زندگی" کے بارے میں بحث کی ہے۔ اس جائزہ اور اس بحث کی روشنی میں اگر غالبیات کے موجودہ سرمایہ کا غیر جانب داری کے ساتھ جائزہ لیا جائے تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ مطالعہ غالب میں ابھی بہت کچھ کام کرنا باقی ہے۔

جیسے جیسے غالب کے مطالعہ کو وسعت ہو رہی ہے ویسے ویسے یہ محسوس کیا جا رہا ہے کہ ڈاکٹر لطیف کی کتاب کوئی غالب شکنی

www.taemeernews.com

نہیں ہے بلکہ غالب کے تعلق سے وہ ایک سائنٹیفک نقطۂ نظر تعمیر کرتی ہے۔

غالبیات پر اتنا سائنٹیفک کام اس سے پہلے نہیں ہوا تھا۔

(۵)

میرزا غالب پر ڈاکٹر زور کے تحقیقی کارناموں کا ذکر کئے بغیر یہ گفتگو مکمل نہیں ہو سکتی۔ ۱۹۳۹ء تک غالب پر مولانا غلام رسول شیخ محمد اکرام، مالک رام صاحب اور مہیش پرشاد کے تحقیقی کارنامے غالبیات سے دلچسپی رکھنے والوں کے سامنے آچکے تھے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری اور ڈاکٹر سید عبداللطیف کے انتقادی کارنامے دو نہایتوں کی طرف رہنمائی کر رہے تھے۔ اس وقت تک ڈاکٹر زور سرگذشت غالب لکھ کر حیدرآباد میں غالب کی یاد تازہ کر چکے تھے۔ ۱۹۳۹ء میں ڈاکٹر زور نے "روح غالب" کے بارے میں لکھے ہوئے مذکورہ بالا تحقیقی اور تنقیدی سرمایہ کی روشنی میں مرتب کی گئی ہے۔ اس میں غالب کی حیات اور کارناموں سے متعلق تمام ضروری باتوں کو نہایت اختصار کے ساتھ یکجا کر دیا گیا ہے۔ میرزا غالب سے اس قدر تفصیلی تعارف کرانے والی اور اتنی مختصر کتاب اس وقت کوئی اور نہیں تھی

یہ کتاب پانچ حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں غالب سے متعلق سارے بنیادی ادب کا جائزہ لیا گیا ہے۔ حصہ دوم میں غالب کی سوانح اور ان کے اخلاق و عادات پر عہد بہ عہد روشنی ڈالی گئی ہے۔ تیسرے حصہ میں غالب کی تمام اردو اور فارسی نظم و نثر کے کارناموں کا تعارف ہے۔ چوتھے حصہ میں غالب کے اعزہ احباب اور تلامذہ کا بیان ہے، اس حصے میں میرزا غالب کے اعزہ اور سسرالی اعزہ کے دو شجرے دیے گئے ہیں۔ ان میں ایک شجرہ علمی دنیا کے سامنے پہلی مرتبہ پیش کیا گیا ہے۔ ان دونوں شجروں میں بعض ایسی اہم تفصیلات ہیں جو کہیں اور نہیں ملتیں۔ یہ تفصیلات ڈاکٹر زور نے غالب کے ان رشتہ داروں سے حاصل کیں جو حیدرآباد میں موجود تھے۔ ان رشتہ داروں میں غالباً غلام فخر الدین خاں کے داماد، سرور جنگ اور اُن کے بیٹے ذوالقدر جنگ، ضیاء الدین احمد خاں، نیر درخشاں * اور میرزا غلام فخر الدین خاں کے پوتے میرزا نصر اللہ خاں، جو حیدرآباد میں صدر محاسب رہے، شامل ہیں۔

* کے احفاد علاء الدین احمد خاں کے بیٹے شجاع الدین احمد خاں

www.taemeernews.com

غالب کی شرحیں

غالب فہمی اردو ادب کا ایک مستقل مسئلہ ہے اس مسئلہ کو حل کرنے کے لیے دو راستے اختیار کیے گئے ہیں، ایک نقدِ غالب کا اور دوسرا شرحِ غالب کا۔ گذشتہ سو برسوں سے نقد و شرح دونوں متوازی خطوط پر چل رہے ہیں۔ لیکن ابھی تک دونوں میں کوئی ہم آہنگی پیدا نہیں ہوئی۔ غالب کی پہلی شرح غالباً میرزا قمر الدین راقم دہلوی نے لکھی تھی جو تلف ہو گئی۔ اس لحاظ سے غالب کی سب سے پہلی شرح حیدرآباد میں عبدالعلی والہ نے لکھی۔ اور دوسری شرح علی حیدر نظم طباطبائی نے لکھی ہے، یہ کام بھی حیدرآباد میں ہوا۔ لیکن غالب کی شرحیں لکھوانے کا خیال سب سے پہلے نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی کو پیدا ہوا اور یہ دونوں شرحیں انہی کی ایما پر لکھی گئیں۔

www.taemeernews.com

ان شارحین کو غالبیات کی تدریس کا وسیع تجربہ تھا۔
حیدرآباد میں ان کے علاوہ بھی اور کئی شرحیں لکھی گئیں۔

وثوقِ صراحت : یہ شرح محمد عبدالعلی والہ نے لکھی جو (۱۳۱۳ھ م ۱۸۹۵ء) میں مطبع نامی فخر نظامی حیدرآباد دکن میں چھپی۔ والہ نظام کالج میں انٹرمیڈیٹ اور بی اے کے درجوں میں غالب کا اردو کلام پڑھاتے تھے۔ یہی تدریس اس شرح کی داعی ہوئی۔ یہ بڑی تقطیع کے تقریباً دو سو صفحات پر پھیلی ہوئی ہے، لیکن اس میں غالب کے غزلیات کے ۱۳۲ منتخب اشعار اور قصائد کے سولہ ابیات کی شرح دی گئی ہے اس شرح میں مشکل الفاظ کے معنی دیئے گئے ہیں۔ تلمیح طلب مقامات کی توضیح بھی دی گئی ہے۔ جہاں تہاں اساتذہ کے اشعار اور ضرب الامثال بھی پیش کیے گئے ہیں۔ کہیں کہیں قواعد اور بلاغت کے اشارات بھی دیئے گئے ہیں نمونۂ شرح:

بیضہ آسا تنگ بال و پر ہے یہ کنج قفس
از سر نو زندگی ہو گر رہا ہو جایئے

"بیضہ بال و پر نکلنے پر رہنے کی جگہ نہیں۔ قفس کنایہ زمین و آسمان سے ہے اس قفس بیضہ مانند سے نکلیں تو اس میں پھنسے نہ رہیں نکل ہی جائیں۔

www.taemeernews.com

وجدانِ تحقیق : یہ شرح عبدالعلی والہ کے فرزند محمد عبدالواجد نے لکھی ہے جو ۱۹۰۲ء میں حیدرآباد سے شائع ہوئی ہے۔ یہ انہی اشارات پر مبنی ہے جو غالباً وثوق صراحت کا حصہ دوم ہونے والے تھے، وثوق صراحت پر مختلف اخباروں نے جو تبصرے کیے تھے ان کو بڑی توجہ سے ملحوظ رکھا ہے۔ وجدان تحقیق میں صرف ردیف الف کے اشعار ہیں واجد نے اس میں وہ تفصیلات بھی داخل کردی ہیں جو والہ اپنے تدریس غالب کے دوران بیان کیا کرتے تھے۔ اس میں اشعار کی شرح بڑی تفصیل سے دی گئی ہے۔ بہت کم اشعار ایسے ہیں جن کی شرح ایک صفحہ سے کم میں دی گئی ہو۔ ایک شعر کی مختصر ترین شرح نمونتاً درج کی جاتی ہے : یاد کر وہ دن کہ ہر اک حلقہ تیرے دام کا
انتظار صید میں اک دیدہ بے خواب تھا

یعنی کسی دن تو عاشقوں کی تلاش کرتا تھا اور تجھکو عاشق نہیں ملتے تھے اور آج یہ حال ہے کہ سینکڑوں عاشق تیرے موجود ہیں۔ اور تجھ کو ان کی کچھ پروا نہیں ہے۔

شرح دیوان غالب : یہ شرح سید علی حیدر نظم طباطبائی کی ہے

www.taemeernews.com

جو بالعموم شرحِ طبا طبائی کے نام سے مشہور رہے ۔ غالب کی تمام شرحوں میں اس شرح کو بنیادی اہمیت حاصل رہی ہے۔ اس کو جو شہرت اور قبول عام حاصل ہوا وہ کسی اور شرح کو نصیب نہیں ہوا۔ اس شرح کی اہمیت اس وقت ٹھیک طور سے سمجھ میں آسکتی ہے جب طبا طبائی کی شخصیت سے مناسب تعارف ہو ۔ یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ طبا طبائی نہ صرف عربی فارسی ادبیات کے جید عالم تھے اور دلبستان لکھنو کے آخری چراغ تھے بلکہ تاریخ عالم اور مغربی علوم سے ان کو گہری واقفیت تھی ۔ قدیم عربی عجمی اور یونانی ادبیات و تاریخ پر ان کی نہایت گہری نظر تھی ۔ ان کا انداز علم قدیم تھا۔ لیکن ان کی فکر مجتہدانہ اور مزاج تجدد پسند تھا ۔ علوم سوانح میں وہ بڑی گہری نظر رکھتے تھے ۔ انہوں نے میرزا غالب کے جاننے والوں سے میرزا کو سمجھا ۔ میرزا کی اردو اور فارسی نظم و نثر کے سرمایہ کا یہ امعان نظر مطالعہ کیا میرزا غالب کی شخصیت ، ان کی طرز فکر اور ان کے فن اور زمانے کو سمجھنے کی جو صلاحیت نظم طبا طبائی میں موجود تھی اور جس طرح انہوں نے غالب کو سمجھا ایسی صلاحیت اور ایسے

www.taemeernews.com

مواقع پھر کسی شخصیت کو میسر نہ ہو سکے۔ یہی وجہ ہے کہ شرح طباطبائی کی ہزار مخالفت کرنے والے بھی ہزار دفعہ اس سے رجوع کرنے پر مجبور ہوتے ہیں، اپنے علم و فضل کی وجہ سے طبا طبائی میرزا غالب سے حقیقی طور پہ متاثر ہیں لیکن مرعوب نہیں ہیں، کلام غالب کو سمجھنے کے لیے طبا طبائی نے جو منہاج مقرر کیا ہے اس سے انحراف میں طالب علم، غالب کے حقیقی مدعا سے دور جا پڑتا ہے۔

طباطبائی نے اپنی شرح میں جابجا جو غلطی بخشیں کیں، اور کہیں کہیں جو خود طبع آزمائی شروع کر دی ہے اس کی وجہ سے استفادہ میں ایک طرح کی الجھن ہوتی ہے۔

شرح ضامن کنتوری: سید محمد ضامن کنتوری، سید محمد کاظم حبیب کنتوری کے خلف اکبر تھے، ۲۵ر جنوری ۱۸۷۴ء کو کنتور کے مردم خیز خطہ میں پیدا ہوئے۔ علیگڈھ میں مولانا حسرت موہانی کے ہم درس تھے ۱۹۰۲ء میں رسالہ لسان العصر جاری کیا۔ کچھ دنوں کے بعد حیدرآباد آئے پھر یہیں کے ہو رہے۔ ۱۹۴۶ء میں حیدرآباد میں انتقال کیا۔ نہایت پُرگو شاعر تھے۔ "نیرنگ مقال اور ارتنگ خیال" ان کے کلام کے مجموعے ہیں۔ ضامن نے انگریزی کی متعدد طویل نظموں

www.taemeernews.com

کا اردو ترجمہ کیا ہے اور عماد الملک سید حسین بالگرامی سے خراج تحسین حاصل کیا۔ ضامن کی غیر مطبوعہ تصانیف کا ایک بہت بڑا ذخیرہ ان کے فرزند کے یہاں محفوظ ہے۔ اسی میں نسخہ حمیدیہ کی شرح بھی ہے۔ اس شرح کا مبیضہ سات جلدوں میں ہے جو مولوی عبدالرزاق راشد مرحوم کے پاس محفوظ تھا۔ ہمارے پیش نظر اس شرح کے مسودات ہیں جو متعدد جلدوں میں ہیں، ضامن نہایت نکتہ رس اور دقیقہ سنج ذہن کے حامل تھے۔ فن شعر و بلاغت میں انہیں بڑی دستگاہ تھی۔ اس کی ضرورت ہے کہ ضامن کنتوری کی "شرح نسخہ حمیدیہ" مناسب اہتمام کے ساتھ شائع کی جائے۔ نسخہ حمیدیہ کے اشعار کے بارے میں بالعموم یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ ایک چیستاں ہے ضامن نے جس خلوصِ فکر کے ساتھ ان مشکلات کو حل کرنے کی کوشش کی ہے اس کے چند نمونے یہاں نقل کیے جاتے ہیں:۔

بسکہ ہے میخانہ ویراں جوں بیابانِ خراب ؛ عکسِ چشمِ آہوئے رم خوردہ ہے داغِ شراب

بیابان خراب ۔ صحرائے ویراں، رم خوردہ ۔ بھاگا ہوا

یعنی میخانہ اس طرح ویران ہوا ہے جیسے کوئی بیابانِ خراب جابجا شراب کے گرنے سے جو داغ پڑتے ہیں، وہ ایسے معلوم ہوتے

www.taemeernews.com

ہیں جیسے ایک صحرا میں چشمِ آہو کا عکس فقط تشبیہ مقصود ہے۔
اور بیابان کی صفت خراب، میخانے کی رعایت سے ہے۔

یک نگاہِ صاف صد آئینہ تاثیر ہے
ہے رگِ یاقوت عکس خطِ جامِ آفتاب

نگاہ صاف سے یہاں مراد نگاہ پُرخلوص ہے، یعنی محبت کی نگاہ اثر کیے بغیر نہیں رہتی۔ دیکھو یاقوت میں جو آب و تاب و خوش رنگی ہے، یہ محض شعاع مہر کی تاثیر ہے۔ نگاہ سے مشابہ پیدا کرنے کو خط کہا اور خط کی رعایت سے جام۔ آفتاب کا استعارہ شراب سے معروف ہے۔

ہے عرق افشاں مشی سی ادھم مشکیں یار کا
وقتِ شب اختر گنے ہے چشمِ بیدار رکاب

مشی = چلنا پھرنا۔ ادھم مشکیں = مشکی یعنی سیاہ رنگ کا گھوڑا۔
محض تشبیہ ہی تشبیہ ہے۔ یار کا مشکی گھوڑا دوڑ دھوپ میں عرق عرق ہو گیا۔ عرق کے قطرے سیاہ جلد پر گویا اندھیری رات کے تارے ہیں اور رکاب جو آنکھ کی شکل ہے ان کو دیکھ رہی ہے یا گن رہی ہے۔ تارے گن کے رات کاٹنا بھی محاورہ ہے۔
اس مسودہ پر ضامن کنتوری نے جو پیش حرف لکھا ہے اس سے شرح لکھنے کی ضرورت اور شرح نویسی میں ان کے اصولوں پر روشنی پڑتی ہے لہٰذا

www.taemeernews.com

یہاں اس کے اقتباسات درج کیے جاتے ہیں :

"نشستم آنچہ زدل بر زبان ما وادی ÷ بہ سہوا گر رقمے کردہ ام قلم درکش
(نظیری)

سرسٹھ برس کا فرسودہ دماغ اور جوان غالب کے کلام کی شرح !

مارا چہ محل لیک عزیزاں نہ پسندند ÷ ہر دل کہ دراو نالہ رنجور نگنجد
(نظیری)

ہے یہ کہ عزیزوں ہی نے اس نالہ رنجور کے سر کرنے پر مجبور کیا۔ نسخۂ حمیدیہ کا بازار میں آنا اور استفسارات کا بازار گرم ہو جانا۔ ہر چند فہم کی نارسائی اور علم کی فرومایگی کا عذر کیا گیا مگر سنتا ہی کون ہے، آخر اس آے دن کی کشاکش سے چھٹکارا حاصل کرنے کی ایک ہی صورت نظر آئی کہ صحیح یا غلط، اچھا یا برا جو سمجھ میں آئے اسے قلمبند کر لو۔ اور جہاں نہ سمجھو زبان بند کر لو۔ رفتہ رفتہ جدید غزلوں کا حصہ مشرح ہو گیا، رہ گئیں صرف متعارف دیوان کی غزلیں، دل نے کہا کہ اب کام ادھورا کیوں چھوڑ دو پورا ہی کیوں نہ کر ڈالو۔ ہوتے ہوتے شرح مکمل ہو گئی، مگر کیا ہوئی اور کیسی ہوئی اس کی نسبت کہنے دیجیے کہ :

نے کسب کمالے شد و نہ طے مقامے ÷ از راہ بجز جنبش و رفتار نہ دانم"[1]

[1] ان اشعار کی شرح اور پیش لفظ کے لیے میں حضرت ضامن کنتوری کے فرزند جناب سید علی ضامن صاحب کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے ازراہ عنایت مسودے سے ان حصول کو نقل کرنے اور اس کتاب میں شائع کرنے کی اجازت دی۔ (شکیب)

www.taemeernews.com

ترجمان غالب : یہ شرح ۱۵ر جولائی ۱۹۵۶ء کو شایع کی گئی ہے۔ اس کے شارح شہاب الدین مصطفےٰ مرحوم، مولانا اشرف شمسی اور مولوی وحیدالدین سلیم کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ اس میں مروجہ دیوان غالب کی بشمول قصائد وقطعات وغیرہ مکمل شرح دی گئی ہے۔ اس شرح کے لکھتے وقت شارح کے پیش نظر ساری اہم شرحیں تھیں۔ شارح نے اختلافات میں الجھے بغیر تمام شرحوں کے پیش نظر اشعار کے جو مطالب مناسب خیال کیے درج کیے ہیں شرح میں بالعموم اختصار سے کام لیا ہے۔ مشکل الفاظ کے معنی بھی دیئے ہیں۔ شرح کا نمونہ یہ ہے :

وہ مرے چین جبیں سے غم پنہاں سمجھا
راز مکتوب بہ بے ربطیٔ عنواں سمجھا

مطلب یہ ہے کہ دوست ہماری صورت دیکھتے ہی غم دل کو سمجھ گیا، جس طرح عنوان کی بے ربطی سے مضمون خط کا اندازہ لگایا جاتا ہے، گویا میری پیشانی لفافہ تھی اور پیشانی کی شکن غم دل کی تحریر۔

—:—

www.taemeernews.com

شذرات

اوپر بیان کیے گئے سرمایہ انتقادیات اور غالب کی شرحوں کے علاوہ حیدرآباد میں وقتاً فوقتاً غالب پر اور بھی تحقیقی اور تخلیقی کام ہوتے رہے ہیں' ان میں سے چند جو ہمارے علم میں آسکے ہیں ان کا مختصر تعارف دیا جاتا ہے۔

یوسف ہندی قید فرہنگ میں : یہ مختصر رسالہ جامعہ عثمانیہ کے ایک ہونہار سپوت محسن بن شبیر نے اپنے زمانہ طالب علمی میں لکھا اور ۱۹۳۲ء میں شایع کیا۔ اس میں غالب کے واقعہ قید کی تفصیلات بیان کی ہیں اور ان واقعات کا اثر خود اُن کی شاعری پر پڑا ہے اس کا جائزہ لیا ہے۔

اصلاحات غالب : مولوی محمد عبدالرزاق راشد مرحوم حیدرآباد کی سول سروس سے وابستہ تھے۔ راشد' علی حیدر نظم طباطبائی کے شاگرد تھے' انہوں نے نظم سے غالب کے بعض ایسے اشعار

www.taemeernews.com

کی شرح دریافت کی تھی جن پر خود غالب نے بعد میں ترمیمات کی تھیں جسکے نتیجہ میں اشعار کے مفہوم میں فرق آسکتا تھا۔ ایسے اشعار کی شرح اور اس پر تقریباً ۱۰۶ صفحات نسخہ کی سوانح حیات کے بارے میں لکھ کر اضافہ کیئے' اسے ۱۹۶۶ء میں اصلاحات غالب کے نام سے شائع کیا۔ راشد مرحوم نے چونکہ یہ کتاب نہایت ضعیف العمری میں مرتب کی ہے اس لیے اس کی ترتیب بڑی الجھی ہوئی ہے۔ تاہم یہ ایک اہم کتاب ہے۔

غالب : یہ مرزا غالب کی شخصیت اور شاعری پر مبنی ایک علامتی تمثیل ہے جو جامعہ عثمانیہ کے ایک لائق فرزند نذیر محمد خاں نے تصنیف کی ہے۔ یہ اکتوبر ۱۹۶۸ء مکتبہ صبا حیدرآباد سے شائع ہوئی ہے۔ اس تمثیل میں غالب کو ایک خاص نقطہ نظر سے دیکھا اور دکھایا گیا ہے۔ وہ نقطہ نظر اس مصرعہ سے واضح ہے :

"میں دشت غم میں آہوئے صیاد دیدہ ہوں"

دودِ چراغ محفل : غالب کی زندگی پر یہ ڈرامہ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ نے لکھا ہے جو جنوری ۱۹۶۹ء میں شائع کیا گیا' یہ مختصر ڈرامہ تین ایکٹ پر مشتمل ہے' اس میں غالب کے سوانحی مواد

www.taemeernews.com

سے نہایت احتیاط سے استفادہ کیا گیا ہے۔

مرزا غالب : یہ اردو ڈرامہ حیدرآباد کے کہنہ مشق تمثیل نگار منجو قمر نے لکھا ہے۔ تین ابواب پر مشتمل ہے، پہلا باب لطف شباب دوسرا اضطراب اور تیسرا انقلاب ہے۔ منجو قمر کو ڈرامہ نگاری کا وسیع تجربہ ہے، یہ ڈرامہ غالب کی حیات اور ان کے عہد کی تصویر پر مشتمل ہے۔ اس میں اسٹیج کرنے کے لیئے تمام جزوی تفصیلات دی گئی ہیں۔

تیغ برّاں : یہ ایک نادر مخطوطہ ہے جو مرزا غالب کی قاطع برہان کے جواب میں فارسی میں لکھا گیا ہے۔ اسکے مولف مولوی عبداللہ نے ایک لغت حدائق العجائب مرتب کی تھی۔ جس کا ایک بڑا ماخذ لغت برہان قاطع تھی۔ جب غالب کی تنقید کا حال معلوم ہوا تو انہیں اپنی محنت شاقہ پر افسوس ہوا۔ بعد میں جب غالب کی تنقید پڑھی تو خود غالب پر افسوس ہوا۔ جواب میں یہ رسالہ ۱۸۶۲ء یا ۱۸۶۳ء میں لکھا۔ اسمیں چوبیس لفظوں پر بحث ہے اپنے استدلال میں مولف نے ہندی دوہے بھی استعمال کیئے ہیں۔ یہ نسخہ مولف کا لکھا ہوا ہے اور چودہ سطری مسطر کے ۱۰۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ اور دفتر ریاستی اسناد آندھرا پردیش کے کتب خانہ مخطوطات میں محفوظ ہے

www.taemeernews.com

آثار

قصیدہ سالار جنگ

(۱)

میرزا غالب نے ۱۸۶۱ء میں مختار الملک کی مدح میں جو قصیدہ لکھا تھا وہ سالار جنگ میوزیم میں محفوظ ہے یہ قصیدہ فارسی کے ترسٹھ اشعار پر مشتمل ہے۔ اس کا فوٹو اس کتاب میں شامل ہے۔ اس قصیدہ کے پس منظر اور اس کے بعد کے نتائج پر اس کتاب کے صفحہ (۸۰) سے شروع ہونے والے مباحث میں معلومات فراہم کی گئی ہیں۔

(۲)

مکتوب بنام ذکا حبیب اللہ ذکا کے نام غالب کے اس مکتوب کی تصویر اس کتاب میں دی گئی ہے۔ نیز یہ خط باب سخن ہائے گفتنی میں ۱۶ نمبر پر درج کیا گیا ہے۔ غالب کی زندگی سے اس مکتوب کے تعلق کے بارے میں صفحہ ۸۰ سے شروع ہونے والے مباحث میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ نادر خط اسٹیٹ

www.taemeernews.com

سنٹرل لائبریری حیدرآباد میں محفوظ ہے۔

مصحح نسخہ دیوان غالب : غالب کا ایک اُردو دیوان ۱۲۷۸ھ میں مطبع احمدی میں چھپا تھا۔ اس نسخے میں بہت سی غلطیاں تھیں۔ میرزا نے ان غلطیوں کی جگہ نشان اندازی کر دی اور ان کی تصحیح کی تاکہ صحت کے ساتھ نیا ایڈیشن شائع کیا جائے۔ دیوان غالب کا یہ نسخہ اسٹیٹ سنٹرل لائبریری حیدرآباد میں محفوظ ہے۔ اس نسخے کے آخری صفحہ پر محمد حسین خاں کے نام میرزا کا ایک خط بھی ہے جس پر میرزا کے دستخط ہیں۔ اس خط کی تصویر اس کتاب میں دی گئی ہے۔

مہر وچغہ : پروفیسر آغا حیدر حسن کے یہاں میرزا غالب کا ایک چغہ اور ان کی ایک مہر ہے۔ یہ مہر جگری عقیق پر کندہ ہے۔ اس مہر کی عبارت حسب ذیل ہے:

"نجم الدولہ دبیر الملک اسد اللہ خاں غالب نظام جنگ"
۱۲۶۲ھ

آغا حیدر حسن صاحب کے بیان کے مطابق غالب کی یہ مہر شاہی مہر کن بدر الدین نے تیار کی تھی۔

ذخیرہ دولت شاہی : نظامیہ طبی کالج حیدرآباد کی لائبریری میں طب کی ایک قدیم کتاب ذخیرہ دولت شاہی محفوظ ہے۔ اس پر میرزا غالب کی مہر ثبت ہے۔

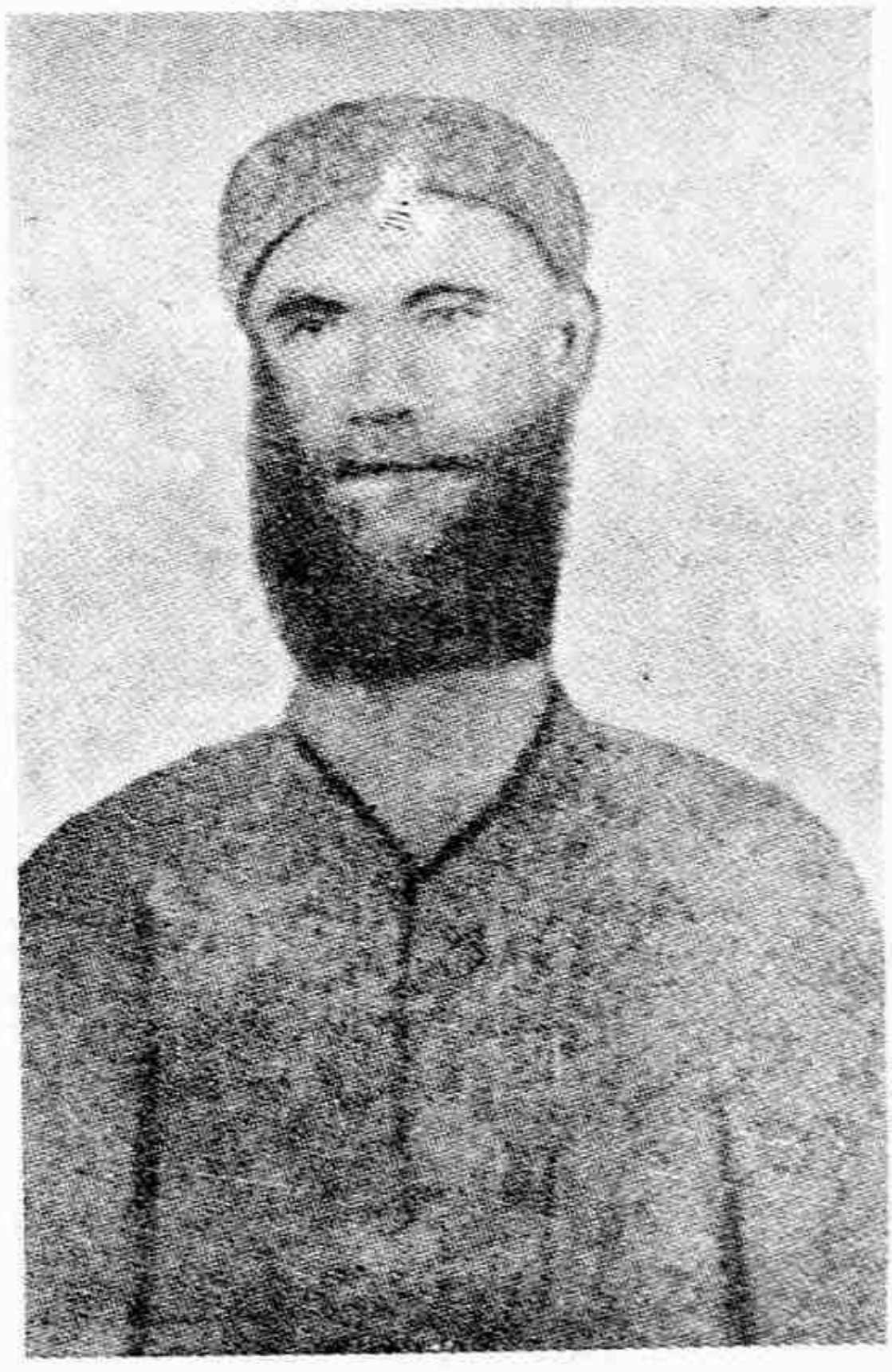

حبیب اللہ ذکا

اغالب کے ایک حیدر آبادی شاگرد ۔ دوست اور شیدائی

مرزا قربان علی بیگ سالک

غالب کے ایک حیدر آبادی شاگرد
جو برسوں غالب کی خدمت میں حاضر رہے

منشی میاں داد خاں سیّاح ، ورنگ آبادی

میاں داد خان سیّاح

غالب کے ایک حیدر آبادی شاگرد جنہیں وہ اپنے نطق کی تلوار کہتے تھے

غلام حسین قدرؔ بلگرامی

غالب کے ایک شاگرد جنہیں نظام کلکتہ سے اپنے ساتھ حیدرآباد لائے

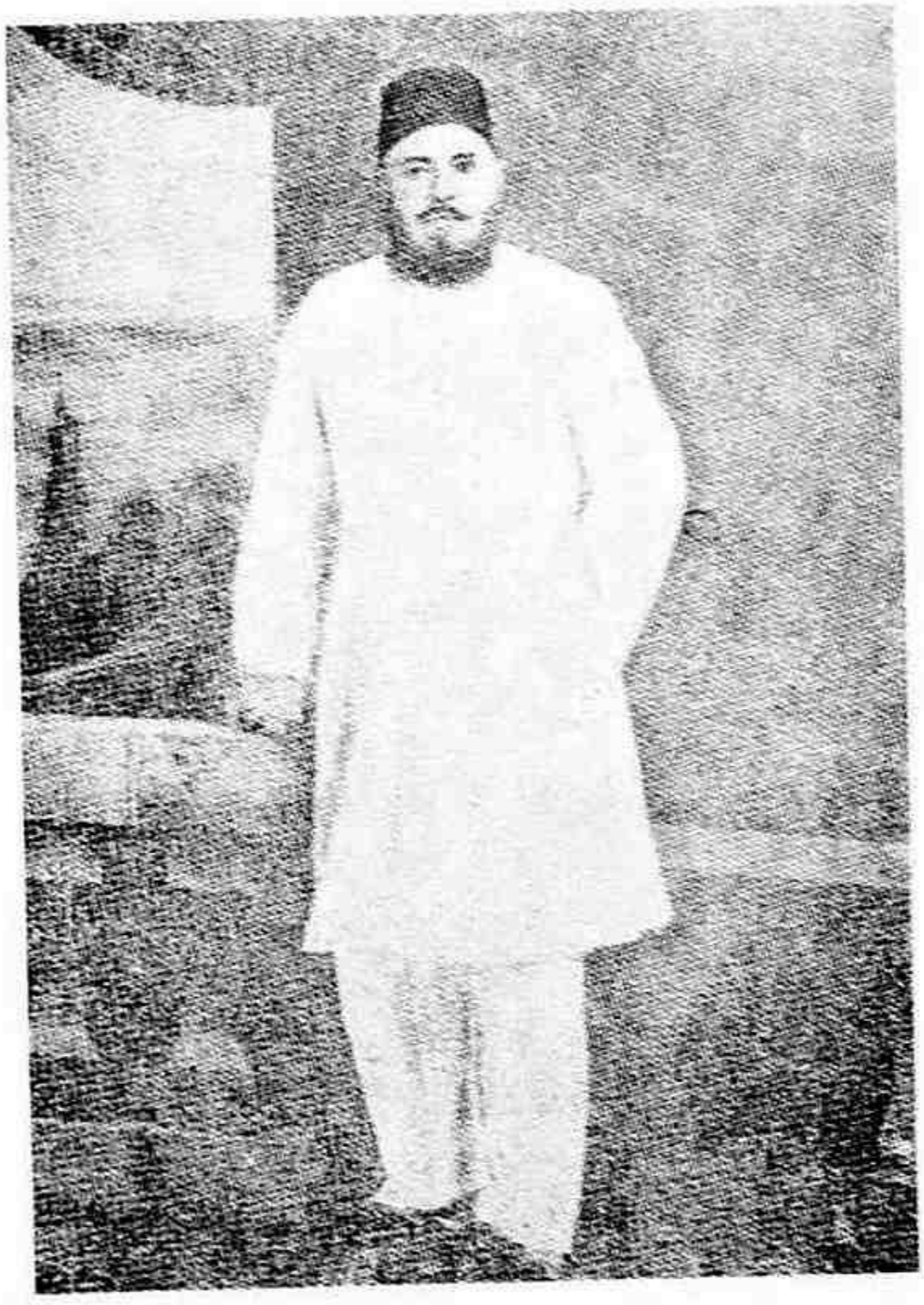

نظم طبا طبا ئی

جنھوں نے غالب فہمی کے دروازے کھول دئے

خواجہ الطاف حسین حالی

غالب کے ایک شاگرد جو حیدر آباد سے

دور رہتے ہوئے بھی قریب رہے

ڈاکٹر سید عبد الطیف

جنہوں نے غالب کے سائنٹیفک مطالعہ کا

سنگ بنیاد رکھا

عذر تمنا روان داشتن چکامه و نگاشتن خطابنامه مقبول و آبروی [illegible]

صحیفه طراز بخشیدن آگهی از رسیدن صحیفه راز منشور بادم

[illegible]

از دیده و بستر نگریم   در سفر غنچه تر نالم   از ناله زبان تا به [illegible]   گر تیر [illegible]   در خون [illegible]

از تشنه و [illegible] نگویم   در سینه [illegible] نگویم   [illegible] نگویم   [illegible] نگویم   [illegible] نگویم

[illegible]

فی الی بود گدای آن در ستم   حاشا که ز ناله باز مانم   آن جاده را که [illegible] دست   دریا به [illegible]   وانگاه [illegible]

[illegible] بگویم   تا بر [illegible] نگویم   [illegible] که [illegible] نگویم   [illegible] نگویم   [illegible] بگویم

[illegible]

والا گهر اسیر [illegible] میرم اگر [illegible] نگویم   [illegible] متاع [illegible] تا آنکه [illegible] نگویم   [illegible]

[illegible]

البته من این ترانه‌ها را شوراننده باستان نگویم   آنم که اگر ز آسمانم   بر سند زر آسمان نگویم

[illegible]

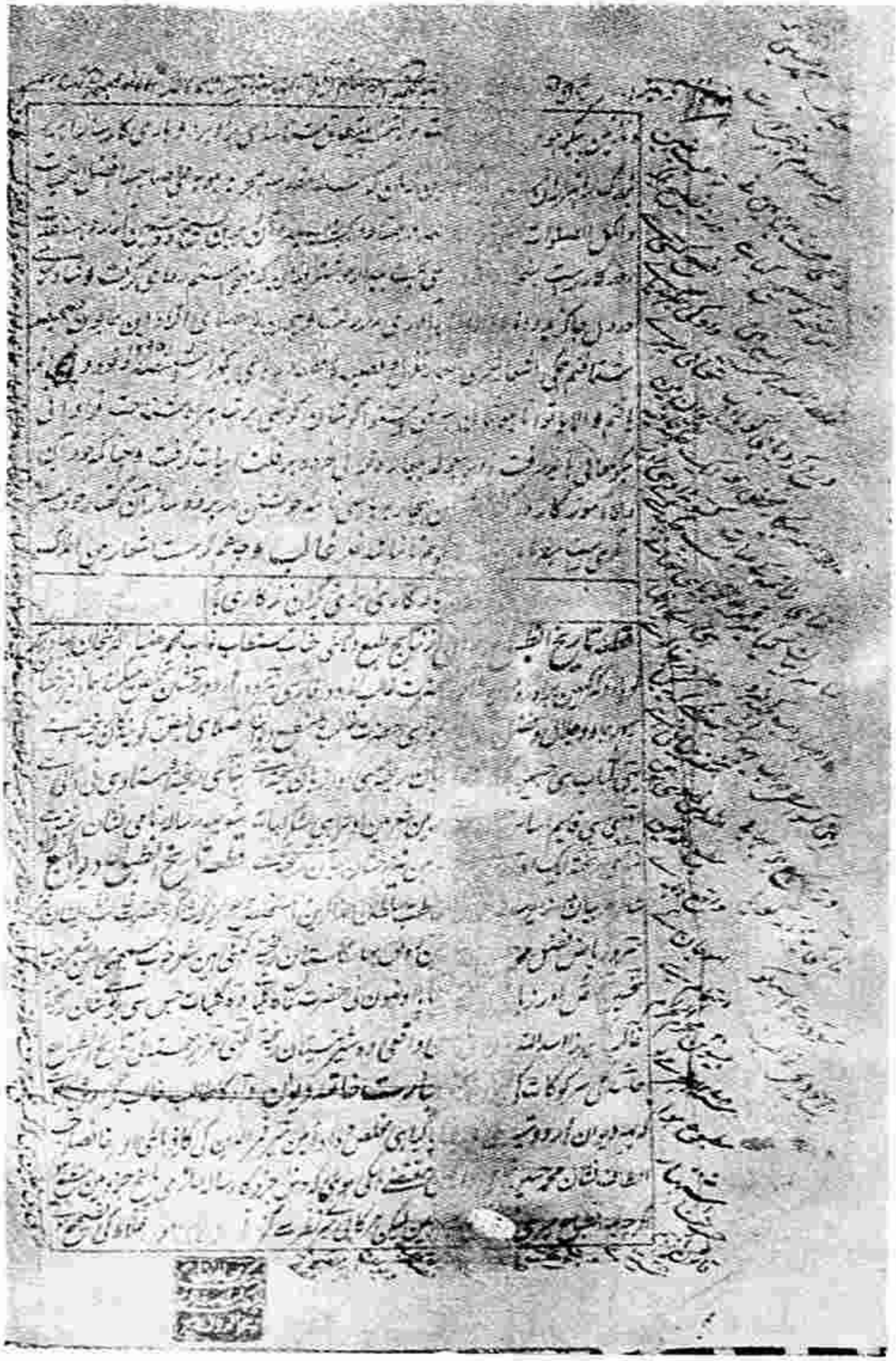

اسٹیٹ سنٹرل لائبریری حیدر آباد کے مطبوعہ نسخۂ دیوان غالب کے حاشیہ
پر غالب کی تحریریں ۔ ان کے اپنے قلم سے

(بشکریہ اسٹیٹ سنٹرل لائبریری حیدر آباد

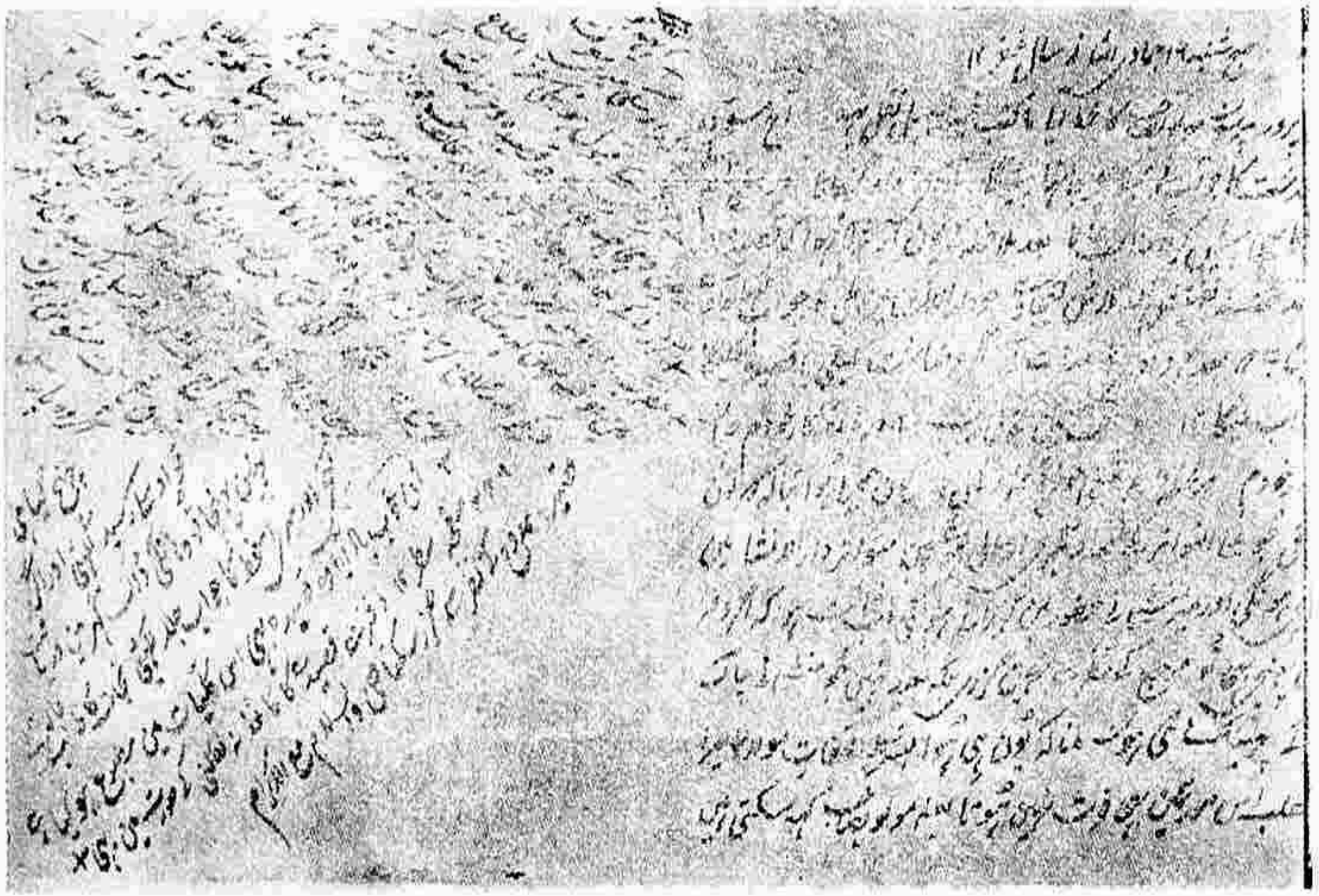

اپنے حیدر آبادی شاگرد حبیب اللہ ذکا کے نام مرزا غالب کا ایک خط

(بشکریہ اسٹیٹ سنٹرل لائبریری حیدر آباد)

www.taemeernews.com